صادقہ نواب سحرؔ
شاعری کے تناظر میں

(ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین سے انتخاب)

مرتبہ حبیب النساء بیگم سید یوسف علی

صادقہ نواب سحؔر

شاعری کے تناظر میں

(ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین سے انتخاب)

صادقہ نواب سحر

شاعری کے تناظر میں

(ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین سے انتخاب)

مرتبہ

حبیب النساء بیگم سید یوسف علی

**SADIQUA NAWAB SAHER:
SHAYERI KE TANAZUR MEIN**

Edited by: Habibunnisa Begum Syed Yusuf Ali
(Mob. 9561580046)

Year of Edition 2018 **ISBN 978-93-88105-60-6**

` 200/-

نام کتاب : صادقہ نواب سحر: شاعری کے تناظر میں

(ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین سے انتخاب)

مرتبہ : حبیب النساء بیگم سید یوسف علی

سنہ اشاعت : ۲۰۱۸ء قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ : وفا اعظمی (دہلی)، موبائل نمبر: 08750270543

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔ M.08401010786
☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدر آباد۔ Ph.040-66822350
☆ حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔ Ph.040-66806285
☆ انجمن ترقی اُردو، حیدر آباد۔ M.09247841254
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد۔ Ph.040-24411637
☆ دکن ٹریڈرس، حیدر آباد۔ Ph.040-24521777
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی۔ Ph.022-23774857
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی Ph.09869321477
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔ M.09433050634
☆ دانش محل، لکھنؤ۔ Ph.0522-2626724
☆ راعی بک ڈپو، الہ آباد۔ M.09889742811
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔ M.09325203227
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر، M.09419761773
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر M.094419407522
☆ گلوبل بکس، سرینگر، M.09070340905
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر، M.09419003490
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں M.09797352280
☆ نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن، M.09450755820
☆ مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

پاکستان میں ملنے کا پتہ

☆ ملک بک ڈپو، چوک اردو بازار، لاہور (پاکستان) Ph: 0092-42-37247480, 37231388

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

میرے شوہر

محمد اطہر انعامدار

کے نام

جنھوں نے میری قدم قدم پر حوصلہ افزائی کی۔

فہرست

مضامین

آج کا چمکتا ہوا ستارہ صادقہ نواب سحرؔ: شاعری کے حوالے سے	مرتبہ: حبیب النساء	11
حرفے چند	کالی داس گپتا رضاؔ	23
انگاروں کے پھول کی شاعرہ	قمر رئیس	25
صادقہ نواب کی نظم نگاری	بشر نواز	26
صادقہ نواب کی شاعری	رفیعہ شبنم عابدی	29
زرخیز ذہن کی اصناف بھر صادقہ	افتخار امام صدیقی	33
شاعرہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ	عبدالاحد ساز	40
صادقہ نواب سحرؔ: تتلی، خوشبو، ستارہ رنگ فنکارہ	افتخار امام صدیقی	43
ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ کی غزل گوئی	میر تراب علی	46
قلم کی نواب۔ صادقہ نواب سحرؔ	نذیرؔ فتح پوری	49
صادقہ نواب کی نظم نگاری	رفیق جعفر	57
ڈاکٹر صادقہ متاشا کی طرح ایک حوصلہ مند عورت	فرحان حنیف وارثی	62
غزل کی شاعرہ: صادقہ نواب سحر	سوریہ بھانو گپت	68

آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت اور ڈاکٹر سحرؔ	وسیم بیگم	70
بکھراتے رشتوں کی داستان، 'پتھروں کا شہر'	دامودر کھڑسے	81
صادقہ نواب سحر کی دلت نظمیں	شاہد پٹھان	83
صادقہ نواب سحرؔ کی غزل گوئی	آر پی شرما مہرش	92
تلخ حقیقت کی غماز ڈاکٹر صادقہ نواب	مادھوری چھیڑا	96
''انگاروں کے پھول اور صادقہ نواب سحرؔ''	نغمہ جاوید ملک	100
صادقہ نواب سحرؔ اردو ادب میں تانیثیت کے حوالے سے	مشتاق احمد وانی	106
صادقہ نواب سحرؔ کی نظم گوئی	نغمہ جاوید	111
زندگی کے بڑے سمندر کی شاعرہ: صادقہ نواب سحرؔ	شوبھناتھ یادو	119
شاعری کی ملکہ ڈاکٹر نواب سحرؔ	وفا اعظمی	121
اکیسویں صدی کی تانیثی شاعرات (صادقہ نواب سحر کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ)	صالحہ صدیقی	126
اردو ادب کی ایک نئی سحر —— صادقہ نواب سحرؔ	سیدہ ترنم بنتِ سید غنی	136
صادقہ نواب سحرؔ کی نظموں میں ماں کا تصور	جاں نثار معین	140
صادقہ نواب سحرؔ اپنی نظموں کے آئینے میں	امرناتھ	154
صادقہ نواب سحرؔ کی نثری نظموں کے اماکن	عمران عاکف خان	161

صادقہ نواب سحرؔ کی بچوں کی شاعری

مہاراشٹر میں ادبِ اطفال اور صادقہ نواب	کلیم ضیاء	171
بچوں کی دلچسپی کا انوکھا سامان	قمر صدیقی	173
بچوں کی ادیبہ صادقہ	آر پی شرما مہرش	175
پھول سے پیارے جگنو	سراج عظیم	180
پھول سے پیارے جگنو: بچوں کے لیے پیارا سا تحفہ	غازی معین	183

نقد پارے

شمس الرحمٰن فاروقی 187

حقانی القاسمی 187

ڈاکٹر برج ولبھ مشرا 188

عبدالاحد سازؔ 188

نندلال پاٹھک 189

ہارون رشید علیگ 189

روہتاش واستھانا 190

ستیش ساگر 191

ڈاکٹر شیو کمار مشرؔ 191

قتیل راجستھانی 192

کملیش بخشی 193

شیو اوم امبر 193

رفیق جعفر 194

●+●

آج کا چمکتا ہوا ستارہ صادقہ نواب سحرؔ: شاعری کے حوالے سے

حبیب النساء بیگم ولد سید یوسف علی

عہد حاضر کے مشہور و معروف فنکاروں میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحرؔ کا ہے۔ صادقہ نواب سحرؔ کسی ایک صنف سے بندھی ہوئی نہیں ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں محترمہ نے اپنے تخلیقی کارنامے انجام دیے ہیں۔ وہ ہمہ اصناف فنکارہ ہے۔ صادقہ نواب سحرؔ نے خود کو تخلیقی سمندر بنائے رکھا ہے۔ نثر میں ناول، افسانے، ڈرامے لکھے ہیں اور نظم میں بچوں کی شاعری، آزاد نظم، پابند نظم، غزل، گیت، دوہے اور دلت نظمیں بھی لکھی ہیں۔ دلتوں کے مسائل سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ سحرؔ صاحبہ بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں۔ وہ اردو ہی نہیں ہندی شعر و ادب کا بھی معتبر نام ہیں اور دونوں زبانوں میں ان کا کام ہیں۔

اردو میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہو کر قارئین کی داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس شعری مجموعے میں غزل اور نظم دونوں اصناف کو شامل کیا گیا ہے۔ شعری مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' (بچوں کی نظمیں) ۲۰۰۳ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''پتھروں کا شہر'' (ہندی میں نظموں کا مجموعہ)، ''پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' (ترجمہ و ادارت، مجروح سلطان پوری)، نثر میں دو ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' اور ''جس دن سے''، ڈرامے کے مجموعے ''مکھوٹوں کے درمیاں''، ''سنگریزے''، غزلوں کا مجموعہ ''دریا کوئی سویا سا'' اور ''اور چھوٹی سی یہ دھرتی'' (مجموعہ نظم) قابل ذکر تصانیف ہیں۔

صادقہ نواب سحرؔ کا پہلا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایک سوانح ناول ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار متاشا ہے۔ اس ناول میں ایک ہندوستانی عورت کی جدو جہد کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی متاشا کی زبان میں ایک مظلوم داستان پر مبنی ہے کہ آج بھی کس طرح ایک متوسط عورت کو ہندوستانی سماج میں ظلم و جبر کا سامنا کر کے جینا پڑتا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں متاشا کے ذریعے جن نسوانی موضوعات اور مسائل کو پیش کیا ہے، ان کا تعلق کسی خواص یا ثروت مند طبقہ سے نہیں ہے بلکہ عام لوگوں اور متوسط طبقہ کی روزمرہ زندگی کے گھریلو مسائل ہیں جن کا بیان خوش اسلوبی سے کرنے کی کوشش کی گئی ہیں جس میں بہت حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

صادقہ نواب سحرؔ کا دوسرا ناول ''جس دن سے'' ہے۔ اس ناول کا موضوع کال سینٹر میں کام کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی، ان کے مسائل ان کے رہن سہن، طور طریقے، عادات واطوار اور لائف اسٹائل کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے حالات و کیفیات وغیرہ ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار جتیش عرف ''جیتو'' ہے۔ پورا ناول جیتو کی زندگی کے طربیاتی کیفیت کے بجائے المیاتی کیفیت کا اظہاریہ ہے۔ جیتو کا کردار اکیسویں صدی کی اس نئی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو کمپیوٹر، انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ اور اسمارٹ فون کو اپنی زندگی کا جز تصور کرتا ہے۔ مصنفہ کے دونوں ناولوں کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ دونوں ناولوں کے کرداروں کے مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ناول میں ''متاشا'' ایک لڑکی ہے اور اس کے اپنے خاندانی مسائل ہیں۔ دوسرے ناول میں جتیش عرف ''جیتو'' ایک لڑکا ہے جس کے اپنے گھریلو مسائل ہیں۔ دونوں ہی کردار اکیسویں صدی کے نمائندے ہیں۔

''خلش بے نام سی'' صادقہ نواب سحرؔ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل سولہ افسانے ہیں۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلی نظر میں ہی قاری کو متاثر کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف مسائل

کی عکاسی کی گئی ہے۔ان میں شادی بیاہ کے مسائل بھی ہیں،غریبی اور بے روزگاری سے الجھا ہوا ذہن بھی ہے۔اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں تانیثیت کی لہر دیکھی جاسکتی ہے۔

''خلش بے نام سی''،''ہزاروں خواہشیں ایسی''،''پہلی بیوی''،''ادھرا ہوا فراک''، ''چاہے ان چاہے''،''ابارشن'' جیسے افسانوں میں عورت کی بے بسی،اس کی خودداری، اس کی مظلومیت اوراس کے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ان افسانوں میں صرف استحصال ہی نہیں ہے بلکہ صادقہ نواب سحرؔ اپنے کرداروں کے ذریعے عورتوں کو آزادی،حوصلے،عزم اور عزت کے ساتھ جینے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں۔افسانہ''ٹی شرٹ'' کے ذریعے سماج میں پھیلنے والی بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ان تمام افسانوں کی زبان سلیس اور رواں ہے، جملے برجستہ ہیں جو قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔

''مکھوٹوں کے درمیان'' صادقہ نواب سحرؔ کے بہترین ڈراموں کا مجموعہ ہے۔اس میں دس ڈرامے ہیں۔یہ تمام ڈرامے سماجی اور نفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں۔ہر ڈرامہ مقصد کا اصلاح ہے۔ڈرامہ''کفن پھاڑ''،''تین دو پانچ''،''میرج بیورو''،اور''ڈسکو کالج ممبئی'' مزاحیہ ڈرامے ہیں۔''دیا جلے ساری رات''،''خودکشی یا موت''،''باادب باملاحظہ ہوشیار''،''گھنگرو بجتے رہے'' یہ سماجی مسائل پر مبنی ڈرامے ہیں۔''ظلم تو ظلم ہے''، ''نفسیاتی''اور''سلطان محمود غزنوی'' تاریخی ڈرامے ہیں۔

اگر ان کی شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو ان کی غزلیں سادہ، سلیس اور چھوٹی بحروں میں ہیں۔ان میں تازگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ان کی شاعری میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ملتا۔اس کے برعکس وہ زندگی کی جنگ محبت سے جیتنا چاہتی ہیں۔سماج کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں سماجی اور معاشرتی مسائل کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔صادقہ نواب سحرؔ کی شاعری میں اپنے عہد کی دیگر شاعرات کی طرح نسوانی جذبات واحساسات کی عکاسی ضرور ملتی ہے مگر انھوں نے اپنی شاعری میں آزادئ نسواں کا لیبل چسپاں نہیں ہونے دیا۔سحرؔ صاحبہ عورت ہیں اور

وہ عورت ہی رہنا چاہتی ہیں۔ان کی پہلی غزل کا شعر میرے دل میں اتر گیا۔

میں عورت ہوں، یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

ہر عورت اپنا گھر بسانا چاہتی ہے۔اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ وہ خوشحال زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتی ہے لیکن کسی کا یہ خواب پورا ہوتا ہے اور کسی کا نہیں۔شاعرہ کو مرد کی برتری سے انکار نہیں، وہ ایک سعادت مند، فرمان بردار بیوی بننے رہنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں اور کہیں بھی اپنے رفیق حیات کے حکم سے سرتابی نہیں کرتیں۔

تمہاری رضا میں ہماری رضا ہے
جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں

غزل کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

آؤ رشتوں کی آبرو بن جائیں ایک روح کی جستجو بن جائے
ہم سما جائیں جسم ودل میں یوں آپ سے تم اور تم سے تو بن جائے

......

خود کو دیوار بنا کر دیکھا ہم نے کس کس کو بچا کر دیکھا
اس کی یادوں میں سحر تھی گم سم اس کی باتوں کو بھلا کر دیکھا

شاعرہ رشتوں کو بہت مقدس مانتی ہیں۔وہ رشتوں کی آبرو پر جان دیتی ہیں اور اس آبرو کو برقرار رکھنے کے لیے وہ حالات کے سامنے دیوار کی طرح ڈٹ جاتی ہیں مگر اس کے باوجود رشتوں کے ٹوٹ جانے پر شاعرہ کو افسوس ضرور ہوتا ہے، وہ سوچتی ہیں۔

لمحوں میں انہیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے

صادقہ نواب سحؔر نے اپنی غزلوں کے لیے چھوٹی بحر کا انتخاب کیا ہے۔انہوں نے اپنی غزلوں میں سلیس زبان استعمال کی ہیں۔کہیں کہیں غزلوں کا معیار کافی بلند ہو گیا ہے،

اگر چہ زبان وہی سلیس رہی ہے اور کہنے کا ڈھنگ وہی میٹھا ہے جیسے ؎

کیا گلہ کرتی ہے زمانے سے درحقیقت کمی رہی مجھ میں
خاموشی ہی مرا مقدر تھی بات اک ان کہی رہی مجھ میں
بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے اے سحر روشنی رہی مجھ میں

نسوانی زبان اور لب ولہجہ ان کی شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی غزلوں میں مثبت سوچ زیادہ اہمیت رکھتی ہے، منفی سوچ سے ہمیشہ انھوں نے گریز کیا ہے۔

زندگی غم ہی نہیں ہم کو خوشی بھی دے گی
دونوں رخ ایک ہوں ایسی کوئی تصویر نہیں

(انگاروں کے پھول، صفحہ نمبر ۵۴)

ہو نہ مایوس اس کی رحمت سے
کیا خبر وہ نواز دے کب کیا

ویسے تو سحر صاحبہ کی تمام غزلیں لاجواب ہیں۔ ان میں سے غزل کے چند اشعار مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ ان شعروں میں ایک ایسی سوچ کارفرما ہے جو قاری کو مایوسی کی بجائے خوشی کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان کی زندگی میں خوشی اور غم دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اگر اس کی زندگی میں غم آئے تو اسے گھبرانا نہیں چاہئے۔ غم کے بعد خوشی حاصل ہونے ہی والی ہے، اس لیے اس سے گزر کر خوشی کا انتظار کرنا چاہئے۔ اندھیرے کے بعد اجالا ہونے ہی والا ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن خوشی ضرور حاصل ہوگی۔

انسان پر جب بھی مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ اسلام میں مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے، اسی لیے شاعرہ یہ کہہ رہی ہیں کہ انسان کو اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، نہ جانے وہ کب کس کو کیا نواز دے۔

کئی غزلیں ایسی ہیں جن میں وہ اپنے محبوب کو آزمانا چاہتی ہیں، مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کوئی ہمدرد غمگسار ملے/ زندگی بخش دے وہ یار ملے/ غم شناسا نہ جاں نثار ملے

اپنے شعری مجموعے ''انگاروں کے پھول'' میں سحؔر صاحبہ نے نظمیں بھی لکھی ہیں، ان میں پہلی نظم ''باقی ہے ایک تو ہی'' ہے۔ یہ نظم اللہ کی شان میں ہے۔ اس نظم میں انھوں نے خدا کو دونوں جہاں کا مالک بتایا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں۔ اس کائنات کی ہر شئے فانی ہو جانے والی ہے اور جو قائم رہے گی وہ اللہ کی ذات ہے۔

نواب صادقہ سحؔر کی نظم نگاری کی عمر اتنی ہی ہے، جتنی ان کے لکھنے کی عمر ہے۔ گو کہ یہ غزل اور نظم لکھتی ہیں لیکن ان کی شعری صلاحیتوں کے جوہر نظم میں مؤثر طریقے سے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے آزاد نظموں کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ جب کہ کچھ پابند نظمیں بھی لکھیں ہیں۔ ان کی آزاد نظموں میں بڑی کشش نظر آتی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں، وہ آزاد نظموں میں کہہ گزرتی ہیں۔ ان نظموں میں روزمرہ کی زندگی کے مشاہدے اور تجربے کی ایسی باتیں ہیں جو قاری کو اپنی باتیں محسوس ہوتی ہیں اور کچھ نظموں کے موضوعات تو ایسے ہیں جو قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور قاری یہ سوچتا ہے کہ یہ میرے دل میں ہے۔

صادقہ نواب سحؔر کی ایک نظم ''بچپن چھوٹ جائے گا'' ملاحظہ کیجئے:

میرے بچپن کی یادوں میں/ بسی پیاری سہیلی/ میرا دل چاہتا ہے/ تجھ سے ملنے کو/ میں تجھ کو ڈھونڈنا چاہوں/ تو بے شک ڈھونڈ سکتی ہوں/ مگر میں تجھ کو ڈھونڈھوں گی نہیں کیونکہ.....

شاعرہ نے زندگی کی ایک بڑی حقیقت کو بڑے ہی پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنی بچپن کی سہیلی کو یاد کرتی ہیں اور اسے اپنے یادوں میں ہمیشہ زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ جیسے وہ بچپن میں ہوا کرتی تھیں۔ زندگی کی یہ حقیقت ہے کہ گزرا وقت کبھی لوٹ کر آتا نہیں۔ اور وقت کے ساتھ انسان بہت بدل جاتا ہے۔ 'کیونکہ' یہاں شاعرہ نے جو وجوہات پیش کئے ہیں وہ بہت زیادہ پسند آئے۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد قاری کو یقیناً اپنے بچپن کے ساتھی ضرور یاد آئیں گے۔ شاعرہ اپنی سہیلی سے اب اس لیے نہیں ملنا چاہتیں کہ اب وہ ان کے بچپن کی سہیلی نہیں بلکہ کسی خاندان کی ذمہ دار خاتون، بیوی، بہو اور ماں کے روپ میں

انھیں ملے گی۔اس سہیلی کی یاد جو سحؔر صاحبہ کے دل میں ہے، وہ دھندلا جائے گی۔

اس کے علاوہ ''آوارہ فصلیں''، ''جنگلی''، ''بس ایک بار'' جیسی نظمیں بہت عمدہ ہیں۔ ''بس ایک بار'' اس نظم میں ایک مشرقی خاتون کا عزم، امید، ارادہ نظر آتا ہے۔اس نظم سے اس کی وفاداری اور خلوص کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہیؤ اس نظم کا یہ مصرعہ ؎

''بس ایک بار میرا ہاتھ تھام کر دیکھ''

بہت ہی پر عزم اور یقین بھرا محسوس ہوتا ہے۔

سحؔر صاحبہ کی ایک اور نظم ''تصور شکن'' مجھے بہت پسند آئی۔ ''اس نظم میں سحؔر صاحبہ نے اپنی شخصیت کو پیش کیا ہے۔شاعری میں شاعر اپنے درد وغم پیش کرتا ہے۔نظم ملاحظہ فرمائیں ؎

شاعرہ شاعرہ کہہ کر نہ پکارو مجھ کو/ کچھ ستائش نہ کرو، یوں نہ نہارو مجھ کو/کوئی بھی بات نہیں مجھ میں کسی شاعر کی/کوئی بھی بات نہیں مجھ میں ستمگاروں کی/

دل پہ اپنے ہی ستم ڈھاتے ہیں وہ صبح وشام/ وہ جو تنہائی میں گھٹ گھٹ کے جیۓ جاتے ہیں/

میں تو وہ ہوں ہی نہیں، جس کو کہو شاعر تم/ میں ہوں ایک عام سی ہستی، نہ کہو شاعر تم/ یہاں نظم کا یہ مصرعہ مجھے بہت عمدہ لگا۔

''میرے افکارِ پریشاں نہ سمیٹ پائیں گے/ لفظ میں، شعر میں، بحروں ہی کے سرمائے میں'' /کہ میرے پاس ہے ناکامی کا نہ رنگ، نہ راگ/ نہ ہی بیزاری ہے غیروں سے، نہ اپنوں کا فراق/ میں سراپا ہوں محبت مجھے شاعر نہ کہو/ میری تکمیل میں اے دوست، کبھی شک نہ کرو/ میں تو عورت ہوں میرا نام محبت رکھ دو/کوئی بھی بات نہیں مجھ میں کسی شاعر کی /شاعرہ، شاعرہ کہہ کر نہ پکارو مجھ کو.....

عورت کو یوں بھی سراپا محبت اور وفا کہا جاتا ہے۔عورت کے ہر رشتے میں محبت، خلوص شامل ہوتا ہے۔ شاعرہ نے اس بات کو اس مصرعہ میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔پوری نظم ہی بہت بہترین ہے۔اس نظم میں شاعرہ کی شخصیت سمٹ آئی ہے۔

سحرؔ صاحبہ نے فطرت کے ہر موضوع کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا ہے، مثلاً ''تتلی'' ''جنگل کی بیری''، ''غضب کی دھوپ''، ''سونا می'' اور ''ڈھلتی شام'' وغیرہ۔

سحرؔ صاحبہ کی ایک اور نظم ''رب کا بول سچا'' ہندوستان کے تمام مذاہب کے لیے غور وفکر کرنے کا مقام ہے۔ شاعرہ نے بڑے ہی مؤثر انداز میں اور چھوٹی سی نظم میں اتنی گہری بات کہہ دی ہے کہ اس ملک میں رہنے والا ہر شخص ہندوستانی ہے اور جب تک ہم ہندوستان کی بولی نہیں بولیں گے، ہم میں یکجہتی نہیں آئے گی۔ اس نظم کا یہ مصرعہ بہت عمدہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

سب کا خون ہے لال کہاں ہے پیلا
کر کے سیاست پھوٹ جوڑالیں وہ کڑوا کسیلا

یہ نظم دور حاضر کے حالات کی بہترین عکاسی ہے۔ آج سیاست میں ''ووٹ'' کے نام پر ہندوستانیوں کو بانٹا جارہا ہے۔ حالات بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن عام ہندوستانی اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ نظم ہم عام ہندوستانیوں کو مثبت سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہے اور ساتھ ہی شاعرہ کی حب الوطنی، قومی یکجہتی اور پرامن شخصیت ہونے کا پتہ بھی دیتی ہے۔

ایک اور نظم آفیس کی فائل ملاحظہ کیجیے ؎

ایسا بھی ایک دن آئے گا / روتے روتے ہنس کر میں / تم سے پوچھوں گی / سپنے سہانے جو تھے دکھائے کہاں گئے / تم بھی شاید، چپ رہنے کا ناٹک کر کے / پچھلے لمحوں سے بچ لوگے / میں بھی آنسو پوچھ کے / بالوں کو سلجھا کر / دنیا کی گہما گہمی میں / آفس کی فائل میں / اپنے جل ڈھونڈھوں گی۔

سحرؔ صاحبہ کی ایک اور نظم ''وہ بھی ہنستے ہیں'' ہے۔ یہ نظم جھونپڑوں میں رہنے والے غریب لوگوں کی زندگی کا حال بیان کرتی ہے۔ جن میں مرد، عورتیں اور بچے ہیں۔ اس نظم کی بنیادی سوچ ایک پڑھی لکھی عورت کی ہے۔ وہ دنگ رہ جاتی ہے کہ ان غریبوں میں بھی خوشی ہے، وہ بھی ہنستے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ غریبوں کے ساتھ مسلسل ناانصافی ہوتی ہے اور ان

کی زندگی میں صرف اور صرف دکھ ہوتے ہیں لیکن ایسے حالات میں بھی وہ خوشی ڈھونڈ لیتے ہیں۔اس نظم کا مرکزی خیال سبق آموز ہے۔ان کی نظمیں مسئلہ کا حل پیش نہیں کرتیں، آئینہ دکھاتی ہیں۔لفظوں کا چناؤ اور خیالوں کا کساؤ ان کی نظموں کا خاصہ ہے۔ان کی نظمیں قاری کو کسی الجھن میں نہیں ڈالتیں، سیدھی بات کہہ جاتی ہیں۔اس سلسلے میں ان کی ایک نظم کے ابتدائی مصرعے ملاحظہ کریں:

جب پتہ چلا/ جھونپڑپٹی کی اس لڑکی کا/ رشتہ طے پایا ہے/ جب پتہ چلا/ دل میں ایک ہوک جگی/ جانے کیوں چوٹ لگی/ دل کیوں بھر آیا/ جب پتہ چلا/ جو سارے محلے میں/ سب سے تیز تھی۔

مذہب کی تبدیلی دل سے بھی ہوتی ہے اور مجبوری سے بھی۔اچھوتوں کے دھرم پریورتن اکثر مجبوری میں ہوتے دیکھے گئے ہیں۔اس سلسلے میں سحرؔ صاحبہ نے ایک نظم بڑی تیکھی کہی ہے۔ملاحظہ فرمائیں: نظم کا عنوان ہے ''اگلی پیڑھی''۔

سنا دلتوں کے ایک پورے گاؤں نے/ دھرم پریورتن کرلیا/ پوچھا تو کہا/ ہمیں نہ سہی / ہماری اگلی پیڑھی کو/ اس کا فائدہ ضرور ہوگا/ کم سے کم وہ تو اچھوت اور/ چھوٹی ذات/ نہیں کہلائے گی۔

ایک اور نظم ملاحظہ کیجیے: نظم کا عنوان ہے ''غلطی''

مجھے ڈر ہے/ تم ایسی کوئی بھی غلطی نہ کر جاؤ/ جسے کر کے/ تم اپنے آپ سے روٹھو/ تمہاری زندگی کو لے کے/ میں نے/ جانے کتنے خواب دیکھے ہیں۔

''غلطی'' اس نظم میں شاعرہ نے اپنے ذہن کے ایک خدشے کا اظہار کیا ہے۔وہ کہتی ہیں کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ میرے ہم سفر کہ تم اپنی زندگی میں کوئی ایسی غلطی نہ کر بیٹھو کہ پھر اس کے بعد زندگی سے ناامید اور مایوس ہو جاؤ، جبکہ میں نے تو تمہارے لیے زندگی کے حسین خواب دیکھے ہیں، تمہارے ساتھ جینے کے خواب دیکھے ہیں۔

صادقہ نواب سحرؔ نے غزل، نظم کے علاوہ گیت بھی لکھے ہیں۔ایک گیت ملاحظہ کیجیے:

جس کا عنوان ہے ''آنکھ کھول کر چلنا بابو'' ۔

آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا

یہ سنسار سہانا دیکھو/ جھرنا بھی مستانا دیکھو/ موجوں کا اترانا دیکھو/ پنچھی کا بھی گانا دیکھو /کوئی نہ کرنا بہانا دیکھو/ آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا۔/ اس جیون کی ہستی کیا ہے؟/ دیوانوں کی مستی کیا ہے؟ /نئی پرانی لبستی کیا ہے؟/مہنگی کیا ہے سستی کیا ہے؟/ بت اور خدا پرستی کیا ہے؟ / آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کو چلنا۔/ روٹی کے ٹکڑوں کی خاطر/ چاندی کے سکوں کی خاطر/ دھرم کا ڈھونگ رچا کرتے ہیں/ کیسے شور مچا کرتے ہیں/آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا۔/ شیطانی ہتھیار سے بچنا/ اس کالا بازار سے بچنا/ بابو ہو پائے جو اتنا /تم رستے پر چار سے بچنا/ بے موقع تکرار سے بچنا/ آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا۔ / اپنے گن پہچانو بابو/ اپنا بھروسہ جانو بابو/قوم اور ملک کی خاطر اب تو/ بن جاؤ دیوانہ بابو /مرنا مٹنا جانو بابو/ آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا۔/ سائنس کہاں پہنچا جانو گے/ دنیا پر جو غور کرو گے/ ملک کی حالت جان سکو گے/ ملک کو تم ہی بدل ڈالو گے/ نام جہاں میں کر ڈالو گے/ آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چلنا۔

اس گیت میں شاعرہ نے ساری دنیا کے حالات اور موجودہ مسائل کو قلم بند کیا ہے۔ آج دنیا میں ایسے حالات ہیں کہ انسان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کی یہ سترنگی نظمیں موجودہ عالمی مسائل کو نظم کرنے میں کامیاب ہیں۔ نظموں کے عنوان ملاحظہ کیجئے ۔

''منزل ہے کہاں ! مایا''، ''آخر کو میں بھی ماں ہوں''، ''سونامی''، ''زمانے کے خداؤں سے''، ''بیٹی''، ''وراثت''، ''ماں اور بیٹی''، ''جنگیں''، ''محفل ہوئی برخاست''، ''اس جہاں کا کیا ہوگا''، ''آتشکدہ'' لاشیں''، ''ڈاکیہ''، ''لیڈیز اسپیشل''، ''گدھے'' اور ''غالب'' وغیرہ۔

سترنگی نظموں کے عنوانات پر نظر ڈالنے سے سحر صاحبہ کا ست شعری اظہار ثابت کرتا

ہے کہ اس کے باطن میں جو تخلیقی سونامی ہے وہ انھیں سانسوں سانس بے چین رکھتا ہے۔
صادقہ نواب سحرؔ کی نثری نظموں میں سوچ کا ایک ایسا آبشار رواں ہے کہ قاری بھی اس میں بہہ بغیر نہیں رہ سکتا، وہ چاہے خود کو کسی بھی طرح قابو میں رکھے۔

صادقہ نواب سحرؔ دور حاضر کی ایک اچھی شاعرہ ہے۔ انھوں نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے حقائق کو شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ صادقہ نواب سحرؔ صاحبہ نے اپنی شاعری میں سادہ اور شگفتہ زبان استعمال کیا ہے۔ ان کا کلام پڑھنے کے بعد براہ راست قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ ان کا لب ولہجہ جوان کو زندہ وتابندہ رکھے گا۔

....

اردو میں فکشن سے وابستہ عظیم قلمکاروں میں ایک نہایت ہی محترم اور باوقار نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ کا ہے۔ وہ بیک وقت شاعرہ، محقق، نقاد، مترجم، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔ وہ ہمہ اصناف فنکارہ ہیں۔ ان کی تمام تخلیقات میں ادبیت بھی پہ اور علمیت بھی۔

صادقہ نواب سحرؔ اردو ہی نہیں ہندی شعر وادب کا بھی معتبر نام ہے۔ مصنفہ کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے یکساں پیار ہے۔ دونوں زبانوں کے ادب میں ان کا نام بھی ہے اور کام بھی۔ مصنفہ نے اپنے ناولوں ،افسانوں اور ڈراموں میں سماجی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ عورت پر ظلم کرنے والوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ میں صادقہ نواب سحرؔ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ وہ نہایت ہی شفیق، مددگار اور مخلص شخصیت کی مالک ہیں۔

اس کتاب کو ترتیب دینے کا خیال مجھے اس وقت آیا جب مصنفہ کی یکے بعد دیگرے کئی تصنیفات منظر عام پر آنے لگیں۔

مصنفہ کی کتاب ''صادقہ نواب سحرؔ شخصیت اور فن'' فکشن کے تناظر میں میرے ہاتھ میں آئی تبھی میں نے طے کرلیا کہ کیوں نہ میں بھی ایسی ہی ایک کتاب ان کی شاعری پر ترتیب دوں، جن میں دیگر اصحاب فن جنھوں نے ڈاکٹر صاحبہ کی تصانیف پر مضامین تخلیق

کیے ہیں، لہٰذا میں نے سحؔر صاحبہ سے بات کی، اپنا ارادہ پیش کیا۔ انھوں نے مجھے کتاب کو مرتب کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے پہلا کام محترمہ کے جن نقادوں، ادیبوں اور محققین سے تعلقات استوار رہے ہیں، ان سے رابطہ قائم کیے۔ اس سلسلے میں ملاقات بھی کی، موبائل پر گفتگو بھی ہوئی۔ سحؔر صاحبہ نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور بھرپور تعاون کیا۔

سب سے پہلے میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرتی ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے خسر اور خوش دامن کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری قابلیت کی قدر کی اور مجھے آگے بڑھنے میں آسانیاں فراہم کیں۔ میں اپنے لختِ جگر نورِ نظر محمد احمد انعامدار عرف نبیل کی بھی شکر گزار ہوں جس نے کتاب کی ترتیب کے دوران مجھے کبھی پریشان نہیں کیا۔

محترمہ صادقہ نواب سحؔر صاحبہ کا بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اپنے قیمتی اثاثہ کو ترتیب دینے کی اجازت دی اور کتاب کی ترتیب کے دوران مجھے مکمل تعاون دیا جس سے مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

اپنے گائیڈ محترم ڈاکٹر مقبول احمد مقبولؔ سر کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے اپنی قیمتی آراء سے مجھے سرفراز کیا۔

اس کتاب کی تکمیل اور اشاعت میں جن ادیبوں اور نقادوں کا تعاون رہا، ان کے بغیر اس کو کتابی شکل دینا میرے لیے مشکل تھا۔ اب یہ کتاب مکمل ہوگئی ہے تو میں ان تمام اہل قلم کی خدمات میں فرداً فرداً شکریہ پیش کرتی ہوں جن کی علمی اعانتوں کے سبب یہ کتاب تکمیل کو پہنچی۔

☆☆☆

شعبہ اردو ڈی۔ ایس۔ ایم کالج

سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی

ناندیڑ، جنتور روڈ پربھنی

حرفِ چند

کالی داس گپتا رضا (ممبئی)

عزیزہ صادقہ نواب سحؔر سے میری پہچان بس اتنی ہے کہ ٹی۔وی کے ایک مشاعرے میں انہوں نے بھی میری صدارت میں کلام سنایا تھا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ یہ مہاراشٹر کے ایک کوہستانی قصبے کھوپولی کے کالج میں لکچرر ہیں۔

اب جوان کا مجموعۂ کلام ''انگاروں کے پھول'' میری نظروں سے گزرا تو حیرت کہ جگہ مسرّت نے لے لی۔ پہلی ہی غزل سامنے آئی تو اس میں یہ شعر نظر میں کُھب گیا ؎

میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

میں نے مجموعۂ کلام پر جستہ جستہ نظر ڈالی تو درج بالا شعر کے پہلے مصرع میں صادقہ نواب کی پوری تصویر پائی۔ دوسرے مصرع پر میں زیادہ اس لئے نہیں کہوں گا کہ ان کے دیباچے ''دولفظ'' سے مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اپنا گھر بسا چکی ہیں اور ان کے شوہر نامدار کا نام اسلم نواب ہے۔ اپنے شوہر کے بارے میں صادقہ نواب کا اپنا بیان پڑھئے:

> '' میں ممنون ہوں اپنے شوہر اسلم نواب صاحب کی جنہوں نے کبھی نہ مجھے ہی غلط سمجھا اور نہ میری شاعری کو بلکہ اس کتاب کی اشاعت میں بھی ان کی حوصلہ افزائی کارفرما رہی ہے ''۔

ایسا نیک اور مددگار شوہر پانے پر صادقہ نواب کو میری دلی مبارکباد۔ مجموعۂ کلام دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس میں غزلوں کے علاوہ چند نظمیں بھی شامل ہیں لیکن جو کلام دامن کشاں

ہوتا ہے، وہ ان کی غزلوں ہی پر مبنی ہے، چنانچہ اس مختصر مضمون میں میں دو ایک باتیں صادقہ نواب کی غزل ہی کے پیش نظر عرض کروں گا۔

پہلی بات تو زبان کی سلاست ہے کہ پورا مجموعہ پڑھ جایئے، اضافت نام کی کوئی چیز شاذ ہی ملے گی۔ رواں دواں الفاظ ایسے کہ زبان سے پھسلے جا رہے ہیں جیسے ؎

غم شناسا نہ جاں نثار ملے/ یوں تو ملنے کو یاں ہزار ملے

سرمئی شام یا سحر بن کر/ زندگی تجھ سے بار بار ملے

عشق کی رہ گزار میں اکثر/ جو ملے ہم کو اشکبار ملے

دوسری بات یہ کہ صادقہ نواب نے بیشتر غزلوں کیلئے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ایک عورت کو ہر طرح زیب دیتی ہیں۔ کہیں کہیں غزل کا معیار خاصہ بلند ہو گیا ہے، اگرچہ زبان وہی سلیس رہی ہے اور کہنے کا ڈھنگ وہی میٹھا ہے جیسے ؎

کیا گلہ کرتی میں زمانے سے/ درحقیقت کمی رہی مجھ میں/ خامشی ہی مرا مقدر تھی/ بات اک ان کہی رہی مجھ میں/ بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے/ اے سحرؔ روشنی رہی مجھ میں

میں کلام اور قاری میں دیوار بننا نہیں چاہتا اس لئے ان چند حرفوں کو یہیں ختم کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ عزیزہ صادقہ نواب سحرؔ میں یہ روشنی تاعمر قائم رہے۔

('انگاروں کے پھول' صادقہ نواب سحرؔ۔ مکتبہ فکروفن ۱۹۹۶ء)

☆☆☆

انگاروں کے پھول کی شاعرہ: ڈاکٹر صادقہ نواب

قمر رئیس

''انگاروں کے پھول'' کا ایک نُسخہ اور تین کتابیں دیوناگری لپی میں ملیں۔ افسوس کہ ہندی پڑھنے سے تقریباً معذور ہوں۔ پھر بھی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اردو کے با کمال ترقّی پسند شاعر مجروح سُلطانپوری کو آپ نے بڑی محنت اور لگن سے ہندی میں متعارف کردیا ہے۔ آپ کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے شاید صحیح لکھا ہے کہ آپ مرد کی برتری کو جانتی ہیں اور اپنے شوہر کی نہایت سعادت منداور فرمانبردار بیوی بنے رہنے میں خوشی محسوس کرتی ہیں۔ یہی نہیں شوہر کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کرتیں۔ یہ تمام حقیقتیں آپ کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں روشن نظر آتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو پہلی بار میں نے اردو کی ایک ایسی پاک دامن شاعرہ کا کلام پڑھا، جس میں شوہر اور شریعت کی پابندی اور وفاداری کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ آج جب ساری دنیا میں عورت آزادی اور مرد کے مساوی حقوق کا مطالبہ کررہی ہے، یہ رویّہ بھی ایک طرح کی بغاوت ہے۔ ہر چند کہ یہ بغاوت عورت کو مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف اور آزادی کے بجائے تابعداری اور غلامی کی طرف لے جاتی ہے۔ پھر بھی اِس قسم کی بغاوت اور آزادی کا حق بھی آپ کو حاصل ہے۔

آپ کے بعض اشعار اور خصوصیت سے آپ کی نظموں میں انسانی دردمندی اور آشوبِ حیات کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کاش اِن سروکاروں کو آپ اپنی تخلیقی فکر میں زیادہ جگہ دیں۔

مصروفیات مانع ہیں، ورنہ کچھ تفصیل سے آپ کی شاعری اور دوسری خدمات کا اعتراف کرتا۔ امید ہے کہ آپ کے بارے میں شاعر کا خصوصی گوشہ پسند کیا جائے گا۔

خیر اندیش

قمر رئیس

صادقہ نواب کی نظم نگاری

بشر نواز (اورنگ آباد)

اردو کی نسائی شاعری کی ابتداء ایک محتاط تحقیق کے مطابق مہ لقا بانو سے مانی جاتی ہے اور سب سے پہلے مغل شہزادی زیب النساء مخفی کا نام کتابوں میں ملتا ہے، جو فارسی میں غزلیں کہا کرتی تھیں۔ ماضی کی خواتین میں نجمہ تصدق کی نظمیں ادبی رسائل میں ملتی ہیں۔ علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم کی تلامذہ میں کافی تعداد خواتین کی بھی تھی لیکن وہ سب صنف غزل کی اسیر تھیں۔ بہت کم خواتین نظموں کی جانب مائل ہوئی تھیں۔ وہ بھی پابند نظم۔

بیسویں صدی کی شاعرات میں سب سے زیادہ شہرت پروین شاکر کو ملی۔ ایسی مقبولیت کسی اور شاعرہ کو نہیں ملی۔ پروین کی غزلوں کے متعدد اشعار زبان زدِ عام وخاص ہیں۔ پروین کی معاصرین شاعرات میں ادا جعفری کا نام بھی آتا ہے۔ نظم وغزل پر یکساں قدرت رکھنے والی شاعرہ کو عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ شاعرات کی بھیڑ میں وہ سب سے پہلے نمایاں ہونے والی ہیں۔ پروین کی معاصرین نظم نگار شاعرہ سارہ شگفتہ مرحومہ ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''آنکھیں'' خاصہ مقبول ہوا تھا۔ پنجابی شاعرہ امرتا پریتم سارہ کی نظموں کو بہت پسند کرتی تھیں اور انھوں نے ان نظموں کا پنجابی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ دوسری نظم نگار خواتین میں رشیدہ عیاں، حمیرہ رحمان، رعنا حیدری، شفیق فاطمہ شعریٰ اہم شاعرات ہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی، فاطمہ تاج، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، حریر انجم، شائستہ حبیب، عذرا عباس کے نام نمایاں ہیں۔ ہندو پاک اور اردو کی نئی بستیوں کی نظم نگار شاعرات میں عذرا

نقوی، سلطانہ مہر، حمید معین رضوی، عذرا پروین، شہناز نبی، شبنم عشائی، ملکہ نسیم، آشا پربھات اور صادقہ نواب سحر ہیں۔

مندرجہ ذیل شاعرات کی نظمیہ شاعری کے بارے میں بہت تفصیل میں نہ جاتے ہوئے میں صادقہ نواب کی نثری نظموں کی بات کروں گا۔

صادقہ نواب سحر موجودہ زندگی کے مطالبات کے پسِ منظر میں اس کے عمل ردعمل کا مطالعہ کرتی ہیں اور جو کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں، اسے لفظی پیکر عطا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کے یہاں شاید طرزِ اظہار سے زیادہ موضوع زیادہ اہم ہے۔ یہاں بھی صادقہ نواب سحر بڑی حد تک محتاط نظر آتی ہیں۔

وہ جب جب کسی نئے موضوع کو الفاظ میں باندھتی ہیں تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے نئے تجربے کو روایت سے وابستہ طرزِ اظہار میں اس طرح ڈھالیں کہ وہ چونکانے سے زیادہ تاثر پیدا کر سکے اور ان کی یہی خوبی انھیں بہت سارے تجربہ پسند لکھنے والوں سے علیحدہ کرتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں کئی ایسی نظمیں مل جائیں گی جو اپنے موضوع اور اظہار کی ہم آہنگی کے بل بوتے پر پڑھنے والوں کو چونکائیں گی بھی اور متاثر بھی کریں گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ ایک سوچنے والی حساس اور پڑھی لکھی خاتون کی نمائندگی کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے گا اور یہی کامیابی اس مجموعے کی اولین شناخت ہوگی۔

ہر اچھا لکھنے والے کی طرح صادقہ نواب سحر بھی اپنے آپ میں منفرد ہیں۔ ان کی مختصر نظمیں خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہیں۔ ان میں جو ارتکاز اور اختصار ملتا ہے، وہی نظموں کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

صادقہ جانتی ہیں کہ کس موضوع کے لئے کون سا پیرایۂ اظہار مناسب ہوگا اور کون سی لفظیات حسبِ حال ہوں گی۔ اس اعتبار سے ہم انھیں ایسی ہوشمند شاعرہ کہہ سکتے ہیں جو لفظ و بیان اور موضوع کے رشتوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ صادقہ پر لکھنے والے کو کم

سے کم اتنا اندازہ تو ہونا ہی چاہئے کہ وہ اپنی بات کو کن الفاظ میں اور کس اسلوب میں بہتر بیان کر سکتا ہے۔

صادقہ کی بعض نظمیں بڑی اچھی اور compact ہیں۔ صادقہ کے سامنے مسئلہ اصناف کو برتنے سے زیادہ اپنے اظہار کا ہے۔ مجھے افسانے یا غزل، نظم لکھنی چاہئے.. انھیں اس سے زیادہ یہ سوچ رہتی ہے کہ اس بات یا خیال کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے۔اس لئے مختلف اصناف واسلوب آزماتی ہیں۔

ویسے اپنے آپ کی دریافت کرنے کا یہ عمل بھی ایک اسلوب کو جنم دیتا ہے۔صرف الفاظ کی تکرار کا نام اسلوب نہیں ہے۔اسلوب محض لفظوں سے نہیں بنتا۔سچا اسلوب فنکار کو محدود نہیں کرتا بلکہ یہ تمام ذہنی وسعتوں کا احاطہ کرنے کا نام ہے۔کچھ دوستوں نے پچاس ساٹھ الفاظ میں اپنے آپ کو محدود کر کے رکھ لیا ہے۔

اسلوب شخصیت کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ ہر اسلوب کے پیچھے صاحبِ اسلوب کی شخصیت کارفرما رہتی ہے۔ جہاں بات بدلتی ہے، یہ اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت رامی شناسم

(چاہے کوئی کپڑا پہنو، میں تمہیں تمہارے قد سے پہچانتا ہوں۔یعنی الفاظ جو بھی ہوں، میں تمہیں تمہارے attitude سے پہچانتا ہوں، ورنہ پہچان مشکل ہو جائے گی۔)

(پیش لفظ 'ست رنگی' صادقہ نواب سحرؔ۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۸ء)

صادقہ نواب کی شاعری

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی (ممبئی)

صادقہ آرا سحرؔ اس لڑکی کا نام ہے جس نے اپنی محنت اور لگن سے اپنی شخصیت کی تعمیر خود کی ہے۔ اپنا مستقبل خود سنوارنے کی کوشش کی ہے اور آج ایک سنجیدہ خاتون کی حیثیت سے ایک مقامی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ صادقہ کو میں اُس کے زمانۂ طالب علمی سے جانتی ہوں، اس وقت سے جب اس نے شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا اور آج جب اُسے شعر کہتے ہوئے دیکھتی ہوں، سنتی ہوں تو خوشی ہوتی ہے۔ صادقہ کی مادری زبان اور ذریعۂ تعلیم کی زبان (ایس ایس سی تک) اُردو رہی ہے مگر تدریس کی زبان ہندی ہے اور صادقہ نے ان دونوں زبانوں کو حتی الامکان اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید اسی لئے اس کی اپنی زبان ہندی اور اُردو کی آمیزش سے عبارت ہے جو اس کے شعروں سے جگہ جگہ مترشح ہوتی ہے لیکن پھر بھی صادقہ نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کون سی زبان کس صنف میں استعمال کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں من کا دریا، عوض، ساجن کو سندیس، میرا سانہیں شیو سا پیالہ، گلہ وغیرہ میں ہندی لفظیات اور ہندی ڈکشن کا غلبہ ہے تو غزلوں میں اُردو کا مزاج۔

صادقہ کی شاعری میں اپنے عہد کی دیگر شاعرات کی طرح نسوانی جذبات و احساسات کی عکاسی ضرور ملتی ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ اُس نے اپنی شاعری پر آزادئ نسواں اور حقوق نسواں کے نام نہاد نعروں کا لیبل چسپاں نہیں ہونے دیا جو آج ہر شاعرہ کے

ہاں ایک فیشن کے طور پر چل پڑا ہے۔ صادقہ عورت ہے اور عورت ہی رہنا چاہتی ہے ۔

میں عورت ہوں، یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

اُسے مرد کی برتری سے انکار نہیں (اگر وہ عورت کے حقوق بحال رکھتے ہوئے ہوتو) وہ ایک سعادت مند اور فرماں بردار بیوی بنے رہنے میں خوشی محسوس کرتی ہے اور کہیں بھی اپنے رفیقِ حیات کے حکم سے سرتابی نہیں کرتی۔

تمہاری رضا میں ہماری رضا ہے
جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں

....

آپ کا حکم فرض ہے مجھ پر
بولیئے مجھ کو حکم ہے اب کیا

وہ محض فرماں برداری نہیں بلکہ اپنے رفیقِ حیات کے سارے درد وغم اپنے دامن میں سمیٹ لینے کیلئے تیار ہے اور ہر حال میں اُسے خوش دیکھنا چاہتی ہے۔ جذبے کا یہ خلوص اس کے مختلف شعروں سے عیاں ہے ۔

اگر کہو تو خوشی سے میں اُن کو سہہ لوں گی/ وہ درد کون سے ہیں جو تمہیں ستاتے ہیں

اس طرح تیری راہوں میں کر دیں گے اُجالے/ راہوں میں بچھا دیں گے ہم آنکھوں کے ستارے

وہ رشتوں کی آبرو پہ جان دیتی ہے اور اس آبرو کو برقرار رکھنے کیلئے حالات کے سامنے دیوار کی طرح ڈٹ جاتی ہے۔

آؤ رشتوں کی آبرو بن جائیں/ ایک دوجے کی جستجو بن جائیں/ خود کو دیوار بنا کر دیکھا/ ہم نے کس کس کو بچا کر دیکھا۔

مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود کوشش کے رشتے استوار نہیں ہو پاتے،

ایسے لمحات میں بھی صادقہ اپنے نام کی طرح سچ کو سچ سمجھ کے قبول کرتی ہے اور بیباکانہ اعتراف کرتی ہے۔

یہ کیسے کہہ دوں تجھ سے گنہگار میں نہیں / اک آدمی ہوں بس کوئی اوتار میں نہیں

جتنا بُرا سلوک کیا تو نے میرے ساتھ / اتنے بُرے سلوک کی حقدار میں نہیں

یہ اور بات ہے کہ سزا تو نے دی مجھے / لیکن تجھے یقین ہے خطاوار میں نہیں

اور پھر وہ اس فیصلے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتی کہ۔

جب اختلاف ہے تو بچھڑنا ہی ٹھیک ہے / تو جانتا ہے مجھ کو ریاکار میں نہیں

مگر اس کے باوجود رشتوں کے ٹوٹ جانے پر صادقہ کو افسوس ضرور ہوتا ہے وہ سوچتی ہے۔

لمحوں میں انہیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے

یہاں شاعرہ ذات کے اس المیے سے دو چار ہوتی ہے۔ جس میں اپنے کو ______ NEGLECT کرنے کا احساس زیاں بھی شامل ہے۔

اوروں کے لئے ہم نے کئی خواب سجائے
اک خواب بھی کیوں اپنے لئے بن نہیں پائے

....

سل مری روح سے کچھ ایسے ملاقات ہوئی
جیسے ملتا ہے کوئی راہ میں بیگانے سے

....

شاخ سے جب بھی پتہ ٹوٹا
جانے میرا دل کیوں لرزا

دہکتے ہوئے شعلوں میں جل کر امر ہو جانا ہر عورت کی طرح صادقہ کی فطرت میں بھی شامل ہے۔

دہکتے شعلے جہاں جسم کو جلاتے ہیں ☆ جنوں پسند وہاں بھی سکون پاتے ہیں

میں صادقہ کو اس شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارکباد دیتی ہوں مگر اُسے یہ جان لینا چاہیے کہ یہ ابھی اس سفر کا پہلا پڑاؤ ہے۔اسے ابھی اور آگے جانا ہے۔زبان کو مزید صاف اور شستہ بنانا ہوگا۔خیالات میں مزید پختگی لانی ہوگی۔ادائیگی کو اور زیادہ پُر اثر بنانا ہوگا۔مطالعہ میں وسعت پیدا کرنی ہوگی۔عرضیکہ صادقہ نواب سحرؔ وہ شاخ گُل ہے جسے شعور کی ہواؤں اور احساس کی نمو پا کر ابھی مزید تازہ، شگفتہ اور سرسبز و شاداب ہونا ہے۔

('انگاروں کے پھول' صادقہ نواب سحرؔ۔مکتبہ فکروفن ۱۹۹۶ء)

زرخیز ذہن کی اصناف بھر صادقہ

افتخار امام صدیقی
(مدیر شاعر ممبئی)

پروفیسر صادقہ نواب سحر کا زرخیز ذہن ہمہ وقت کسی نرگسی طوفان کی طرح اس کے اندرون میں اپنا کام کرتا رہتا ہے اور پھر کبھی ناول تو کبھی افسانہ، طنز و مزاح، ڈارمہ، بچوں کے لئے نظمیں، ہندی ادب کے ترجمے تو کبھی غزل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک بے چین تخلیق کارہ نے اپنے ذہنی بہاؤ میں ۲۱۴ طویل و مختصر نظمیں کاغذ بند کر دی ہیں۔

ستر نگی نظموں کے اس مسودے کی پہلی نظم 'سب رنگی' ملاحظہ کیجئے:

ست رنگی زندگی / سولہ سنگار کئے بیٹھی ہے / تیری پازیب سے / کتنی ہی دھنیں پھوٹتی ہیں / تجھ سے ہی رنگ لئے / روشنی سنگیت کی دھن / ان میں گھلا دیں میں نے / حادثے جو بھی ہوئے / اپنے پرائے دل پر / چوٹ مجھ پر ہی پڑی / شکریہ حادثو! / تم نے سکھائی زندگی / بڑا احسان ہے / تم نے لکھائی زندگی!

دوسری نظم 'طوطے'

ساہتیہ اکادمی کے ڈارمائی مقابلے میں / میرے آس پاس کے لوگوں میں / میرے بچپن کے دوستوں / کالج کے ہم نواؤں / تعلیم یافتہ، قابل لوگوں کا طومار ہے۔ چلو ٹھیک ہے / بہت سے لوگ جانے پہچانے ہیں / مگر عجیب سی بات ہوئی / ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف / میں نے نظر گھما کر دیکھا / اس طرف کچھ پتر کار، کوئی نقاد، کوئی شاعر تھا / دوسرے طرف اداکار، کلاکار اور ساہوکار، / مگر میرا وہاں کوئی دوست، / کوئی اپنا، کوئی عزیز نہیں تھا۔ /

سبھی کی آنکھوں میں رمیں اجنبیت کی مسکراہٹ دیکھتی ہوں رشاید کوئی مجھے پہچانتا نہیں ہے ر کیوں کہ میں ایک عورت ہوں راور ایک شریف باوقار خاتون کو بھی رسو کالڈ شریفوں کے بیچ ر نہ پہچاننا شریف باوقار مرد کی رشرافت کی پہچان ہوتی ہے۔

صادقہ نے سترنگی نظموں میں درس وتدریس، ہندی زبان، اردو، انگریزی، سیاحت، مطالعہ، اس کے ہمعصر دوست دشمن، شوہر کا پیار، بچوں سے دلار، ان تمام میں تجربات و مشاہدات من وعن حرف ولفظ میں سمودیا ہے۔اس ضمن میں اس کی نظم 'مجھے ڈر ہے' پیش ہے:

مجھے ڈر ہے رکہ میرے بعد رمیری شاعری مجھ کو رکہیں بدنام نہ کردے۔کہا جاتا ہے۔ شاعر رشاعری میں راپنا جیون کھول دیتا ہے۔رمگر ہے زندگی کیا راپنا ہی دُکھ سکھ رکہ ان جگ بیتی کے رکیا آپ بیتی ربھی ہے ممکن ر ہزاروں عشق کی ہیں داستانیں رشعر ونغموں میں ر ہزاروں ہم جو بکھرے ہیں چمن میں رسب ہیں مالی کے میں مالن ہوں رکہ میں پرورش کی ہے رکہ ہر اک پھول کی خوشبو رنگارنگی رکلی کا مسکرانا رخار کا دامن کو رالجھانا ر مجھے محسوس ہوتا ہے ر مجھے تحریک دیتا ہے۔

وہ بن کر پریرنا رمیرے قلم سے پھر اُبلتا ہے رجو ساری زندگی جیتی رہی رکردار کو تھامے رغرض یہ کہ شاعری ہی اُس کو لے ڈوبی رقیامت ہے رہے میری شاعری کیا رشاعری ہی کی روایت ہے۔

نیا کچھ جذب اس میں کرسکوں رمیری لیاقت ہے، مگر ر مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد ر میری شاعری رمجھ کو کہیں بدنام نہ کردے رکہ شاعر میں جو ہوتی رمرد شاعر ر میں اپنی زندگی کو شاعری کے نام کردیتی۔

نہ جانے کتنی واہ واہی رمرے حصے میں آجاتی رمیں عشق دعا عاشقی کی شاعری کو رجوش سے سنتی سناپاتی رمگر میں شاعرہ ہوں۔

ایک عورت رماں، بہن، بیوی رکہ جس پر آبرو کا سُرخ لیبل رجگمگاتا ہے رکہ جس کی آنکھ دیکھے رکان سن لیں ر پر زباں چپ ہو رجو اپنی شاعری میں زندگی کے راز نہ کھولے رجو بولے تو سنبھل کر رکھل کے بالکل بھی نہیں بولے رمگر میں ایک انساں ہوں رابھی دیکھتی

اگر چہ شاپ ہے/اظہار مجبوری/خاموش رہنا بھی تو کب وردان ہے/ پرے لئے/کہ ہے ڈر مجھ کو/میری شاعری مجھ کو/نہ لے ڈوبے/کہ یہ امید ہے مجھ سے/کہ میں چپ ہی رہوں گی /خود پہ گزرے یا زمانے پر/قلم کی جیب پر میں اُن کو/ہرگز ہی نہ لاؤں گی/مجھے ڈر ہے/کہ میرے بعد/میری شاعری مجھ کو/کہیں بدنام نہ کردے/مجھے ڈر ہے۔

ان نظموں میں اگر آپ بیتی ہے تو جگ بیتی بھی ہے بلکہ دونوں کے امتزاج سے ہم بیتی والی نظمیں بھی ہیں۔صادقہ کا حساس شعور، اس کی سوچ آنکھیں، خیال سمندر، اتنا تند و تیز ہے کہ بعض اوقات وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ پاتی اور نظموں میں منعکس ہو جاتی ہے۔ان نظموں میں جہاں ایک عورت جو کہ بیوی بھی ہے۔اسے مرد سماج کے خلاف احتجاج بھی کرنا ہے جبکہ وہ اپنے تعلیم یافتہ شوہر کے خوش رنگ حصار میں بھی ہے لیکن وہ ایک جواں سال اور عزت و شہرت والی لڑکی بھی ہے، جسے مردوں کہ ہمہ وقت کی بھوکی پیاسی، ہوس دار آنکھیں ٹٹولتی رہتی ہیں۔

ان سب سے بچ کر سماج میں رہنا اور اپنے وقار کو فلک بھر قائم رکھنا ایک تعلیم یافتہ اور نوکری پیشہ عورت کیلئے مشکل ترین امتحانوں سے گزرنا ہے لیکن صادقہ سُرخرو ہیں کہ انہوں نے اپنے حدود کو سمجھ لیا ہے اور اپنے مکان کو انہوں نے 'گھر جنت' بنا دیا ہے۔وہ خوش و خرم اپنی جنت میں ہر طرح مطمئن ہیں۔اگر وہ غموں غم افسردہ ہیں تو اپنی ہم جنسوں کے لئے ان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے لئے وہ اپنے قلم کو تلوار بنائے رکھنے کی سعی کرتی رہتی ہیں۔

صادقہ کو اردو عالم اور ہندی جگت میں یکساں مقام حاصل ہے۔ایک بار میں نے صادقہ سے سوال کیا: ''کیا تم نے جو کچھ لکھ لیا ہے۔اس سے مطمئن ہو''؟ اس نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا: ''جو کچھ لکھ لیا ہے، اس سے مطمئن تو ہوں لیکن ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔''

صادقہ کی یہ ست رنگی نظمیں موجودہ عالمی مسائل کو نظم کرنے میں کامیاب ہیں۔نظموں کے عنوانات ملاحظہ کیجئے:

''سونامی''، ''زمانے کے خداؤں سے''، ''بیٹی''، ''وراثت''، ''ماں اور بیٹی''، ''منزل ہے کہاں!''، ''مایا''، ''محفل ہوئی برخاست''، ''میرا آتشکدہ''، ''آخر کو میں بھی ماں ہوں''،

''میرے ادھورے کام''، ''آج کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا''، ''لاشیں''، ''ڈاکیہ''، ''لیڈیز اسپیشل''، ''جنگیں''، ''اس جہاں کا کیا ہوگا''، ''گدھے''، ''غالب سے'' وغیرہ۔

نظم ''غالب سے'' ملاحظہ کیجیے:

تو گیا/تجھ سے، ملنے کی خاطر/ میں نے کتنے جنم لئے ہوں گے/اپنی پہچان میں بنا پاتی/تجھ سا خود کو بھی میں بنا پاتی/تیرے یگ میں بھی جی رہی تھی میں/تجھ سے پہلے بھی کہہ رہی تھی میں/چاہتی تھی مشاعرے جاؤں/بزم شعر وسخن کو گرماؤں/ناری ہونا مرا عذاب رہا/کھل کے کہنا مجھے نہ راس رہا/تب سے اب تک جنم میں لیتی رہی/تجھ سے یہ پوچھنے کو جیتی رہی/مجھ میں اور تجھ میں کیا ہے فرق بتا/کیا مرے لفظ کھنکھناتے نہیں/کیا خیالات گنگناتے نہیں/میں زمانے کو جان سکتی نہیں/ایسا ہرگز میں مان سکتی نہیں/پھر بتا کیا کمی رہی مجھ میں/ایک نہ ایک دن ملیں گے ہم/تجھ سے پوچھیں گے بات بتلانا/میں بھی غالب بنوں گی اک دن نا۔

ستر نگی نظموں کے عنوانات پر نظر ڈالنے سے صادقہ کا ست شعری اظہار ثابت کرتا ہے کہ اس کے باطن میں جو تخلیق سونامی ہے، وہ اسے سانوں سانس بے چین رکھتا ہے۔

نظم ''سرسوتی'' میں تعلیم یافتہ، ذی شعور اور اخلاق ذہن کی صادقہ سرسوتی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے خود کو معمولی تصور کرتی ہے حالانکہ خود سرسوتی دیوی صادقہ میں براجمان ہے۔ وہ خود ساکشات سرسوتی ہی تو ہے۔

صادقہ کی نثری نظموں میں سوچ کا ایک ایسا آبشار رواں ہے کہ قاری بھی اسی میں بغیر بہے نہیں رہ سکتا، وہ چاہے خود کو کسی بھی طرح قابو میں رکھے۔

نظم ''کل رہوں نہ رہوں''

کل رہوں نہ رہوں/میری قربانی ضائع نہیں جائے گی/عورت ہوں/اور عورت کی قربانی/کبھی ضائع نہیں جاتی/وہ اُس کی بیٹی میں/جذب ہو جاتی ہے/ایک نئی عورت کے روپ میں/دوبارہ/قربانی کی مثال بن جاتی ہے۔

عورت ہونا صادقہ کے یہاں ایک نعمت ہےتو سراپا زحمت بھی ہے۔ وہ عورت کو اس کی معراج سمجھتی ہے۔ مرد سماج میں عورت کے الجھے ہوئے مسائل کو وہ سلجھانا چاہتی ہے۔ وہ کبھی ماں، بیٹی،، بہن،، بہو، عورت کے وہ تمام روپ جو رشتوں کو جنم دیتے ہیں، ان سب کے مسائل کو موضوع بناتی ہے۔

نظم ''میرا سا نہیں''

زہر تو میں میرا کی طرح پی سکتی ہوں رمگر اُسے پینے میں میری سُبکی ہے رشیو کی طرح ر پی لوں گی میں زہر زمانے کا راور کرشن سی رسانولی ہو جاؤں گی رکوئی بتائے۔

میرا کے پیالے سے بہتر رمیرے دل کا پیالہ ہے کے نہیں رزہر تو میں میرا کی طرح پی سکتی ہوں رمیں شیو کی طرح پی لوں گی زہر زمانے کا!

یہ نثر پارے کیا ہیں؟ وہ سوچ انگارے ہیں جو صادقہ کے وجود میں ہمہ وقت دہکتے رہتے ہیں اور کبھی سرد نہیں ہوتے۔ انہیں کی روشنی سے وہ افسانے، ڈرامے، نظم غزل، طنز و مزاح، بچوں کا ادب ہمہ اصناف بن جاتی ہے۔ اگر صادقہ چاہےتو ان نثر پاروں کو یک ستری بھی کر سکتی ہے اور داستان بھی بنا سکتی ہے۔ لیکن اسے تخلیقی بہاؤ میں کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ ان نظموں میں اس کی پسندیدہ اصناف کی جھلک بھی ملتی ہے۔ ایک طویل گیت 'آنکھ کھول کر چلنا بابو' دیکھئے:

''آنکھ کھول کر چلنا بابو''

آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل ریہ سنسار سہانا دیکھو رجھرنا بھی مستانا دیکھو رموجوں کا اترانا دیکھو رپنچھی کا بھی گانا دیکھو رکوئی نہ کرنا بہانا دیکھو رآنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل ر اس جیون کی ہستی کیا ہے ردیوانوں کی مستی کیا ہے رنئی پرانی بستی کیا ہے رمہنگی کیا ہے سستی کیا ہے؟ ربُت اور خدا پرستی کیا ہے؟ رآنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل رروٹی کے ٹکڑوں کی خاطر رچاندی کے سکوں کی خاطر ردھرم کا ڈھونگ رچا کرتے ہیں رکیسے شور مچا کرتے ہیں رآنکھ

کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل رشیطانی ہتھیار سے بچنا راس کالے بازار سے بچنا ر بابو ہو پائے جو اِتنا رتم رستے چار سے بچنا ربے موقع تکرار سے بچنا ر آنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل راپنے گن پہچانو یارو راپنا بھروسہ جانو یارو رقوم اور ملک کی خاطر اب تو رمر نا مٹنا جانو یارو ربن جاؤ دیوانو یارو رآنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل رسائنس کہاں پہنچ جاتا ہے ردنیا پر جو نظر ڈالو گے رملک کی حالت جان سکو گے رملک کو تمہیں بدل ڈالو گے رنام جہاں میں کر ڈالو گے رآنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل رمندر مسجد اور گرودوارے ربھائی بند وسکھاتے ہی ہیں رہم کیوں بھول رہے ہیں ان کو رچونا گارا لگاتے ہی ہیں راپنے ہاتھ بناتے ہی ہیں رآنکھ کھول کر چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل رکتنے دن ہم دکھی رہیں گے ردھن والے ہی دکھی رہیں گے ر گود میں بیٹھ کے دھرتی ماں کے رخون پئیں گے سکھی رہیں گے رانت میں یہ ہی دکھی رہیں گے ر آنکھ کھول کر چلنا بابو، رآنکھ کھول کر چل رشیطانی ہتھیار سے بچنا راس کالا بازار سے بچنا ربچو ہو پائے جو اتنا رتم ستے پر چار سے بچنا رآنکھ کھول چلنا بابو، آنکھ کھول کر چل۔

لیکن صادقہ اپنی مختصر نظموں میں زیادہ مرتکز معلوم ہوتی ہے۔''بجلی'' اور ''چنوتی'' ملاحظہ کیجیے۔

''بجلی''

ایک بے چین سی تڑپتی روح رمیرے اندر سما کے کہتی ہے ریہ جو سنتے ہو روز افسانے ر روز بنتے ہیں لوگ دیوانے رخواب رنگیں کی نرم نرم تمہیں ربستر عیش بن کر سجنے لگیں رمرمریں جسم پر پڑے زیور رمخملیں سیج بن کے سجنے لگے ران سُہانے خوابوں میں رمیرا دل ڈول ڈول جاتا ہے اور اِس ڈولتے ہوئے دل مین رایک بجلی سی دوڑ جاتی ہے۔

''چنوتی''

میں ایک چنوتی ہوں رہونے کو تو ہوتی ہوں رآنکھوں کو بھگوتی ہوں رنا کامی کے

خاروں کو / دھاگوں پر پروتی ہوں۔ / ہر ترچھی نظر کا بان دل کو میرے بھیدے گا / ہر زخم کریدے گا / میں جوش ہوں انساں کا / میں ایک چنوتی ہوں / جب میں نہیں ہوتی ہوں / تب ہر کوئی سوتا ہے / پھر کچھ نہیں ہوتا ہے۔

جوں جوں میں صادقہ کے نثر پاروں میں اترتا رہا، وہ مجھ پر ہر زاویے سے منکشف ہوتی چلی گئی۔ تہہ در تہہ، پیچ در پیچ کہیں آسان تو کہیں وہ کسی فلسفی کی طرح مکالمہ کرتی ہے۔ کہیں وہ گونج ہے تو کہیں شور، خاموشی اور سناٹا بھی۔ مجھے ان نظموں کے مطالعے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ صادقہ کی کچھ ہی نظموں نے مجھے ان تمام سوچ منظروں سے آشنا کروادیا جو ان کی تمام نظموں سے ابھرتے ہیں اور قاری کے شناسا منظروں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آخر میں ایک نظم ''بھجن'' سے میں ان نظموں کے افہام و تفہیم کی ابتدا کروں گا۔

''بھجن''

ٹرین کے آخری ڈبے میں / ایک بالک گاتے گاتے / رُک کر بولا / بی بی جی بھوکا ہوں / بھگوان کے نام پر / ایک روپیہ............ مجھ کو بڑی بھائی / آواز، ایک اور بھجن / ہم کو تو سُنا دے / اور یہ روپیہ پالے / میری / بات سنی اور / ننھا بالک / ہارمونیم کے / ٹوٹے تاروں کے ساتھ / گاتا رہا بھجن پرانا / بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا

ان نظموں کے مطالعے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ سترنگی نظمیں ایسے تخلیق پارے ہیں کہ ان سے جو بھی چاہے صنف و ہیئت تشکیل دی جاسکتی ہے۔

('باوجود' صادقہ نواب سحر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۸ء)

شاعرہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ

عبدالاحد سازؔ (ممبئی)

یوں تو اردو شاعری میں نسوانی لب و لہجے اور تانیثی پیرایۂ اظہار کے سرے میرا بائی سے بھی ملتے ہیں اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں رائج لوک گیتوں سے بھی لیکن ہم عصر یا جدید شاعری میں تانیثیت کا ورود اس روایت کے استقرار کے ساتھ کئی نئی جہتیں اور سطحیں لئے ہوئے ہے۔ اب نسوانی طرز اظہار محض عورت کے 'واحد متکلم' میں اپنے عشق و محبت کے جذبات کو بیان کرنے یا اپنے محبوب کے تعلق سے اپنے تاثرات ظاہر کرنے کا نام نہیں، بلکہ زندگی کے گونا گوں تجربات اور متفرق خیالات کو سمیٹتے ہوئے عورت کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کے عمل سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ کی شاعری کو اسی تعریف کے تحت دیکھنا احسن ہوگا، جس میں نسائی زاویے سے زندگی کو سوچنے، محسوس کرنے اور اظہار کرنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نظموں کے زیر تبصرہ مجموعے ''پتھروں کا شہر'' میں زندگی کے حقائق سے متصل خاصا تنوع ہے، مثلاً پہلی ہی نظم ''ٹوٹتے آدرش'' زندگی کے تضاد کو سمجھنے، قبول کرنے اور سہنے کا اعتراف ہے۔ یہ نظم بعد کی کئی نظموں کو پڑھنے کے لیے ایک کلید کا بھی کام کرتی ہے، مثلاً آگے کی ایک نظم ''لاشیں'' میں اس تلخیٔ فکر کا بھی جواز بنتی ہے کہ

''شاید میں نے بھی/کئی لاشیں دیکھی ہیں/ زندہ بھی اور مردہ بھی/ شاید مجھے بھی پریرنا مل جائے/ میں بھی نکل پڑی ہوں/ گیان کی تلاش میں/ زندگی کی حقیقت کو جاننے کے لیے/ سنسار میں کم سے کم/ ایک ایسے گیان کے پرچار کے لئے/ جس سے میری لاش صرف لاش نہ رہے''

نظم ''طوطا'' میں طوطا چشمی کی رعایت سے یہ طنزیہ رخ اختیار کرتی ہے کہ

''سبھی کی آنکھوں میں/ میں اجنبیت کی مسکراہٹ دیکھتی ہوں/ شاید کوئی مجھے پہچانتا نہیں ہے/ کیونکہ میں ایک عورت ہوں/ اور ایک شریف باوقار خاتون کو بھی/ 'سو کالڈ' شریفوں کے بیچ/ نہ پہچاننا/ شریف وباوقار مرد کی/ شرافت کی پہچان ہوتی ہے!

ایک عام ناقدانہ تاثر ہے کہ نسوانی شاعری میں آہ وبکا، شکوہ وفریاد اور گریہ وآشوب کے شیڈس گہرے ہوتے ہیں مگر اسے کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گو کہ صادقہ سحرؔ کی کئی نظمیں اس سے مبرّا نہیں ہیں مگر کئی اور نظمیں ایک استثنائی حکم ضرور رکھتی ہیں جو زندگی کی مسرت وحرارت، رجائیت وطمانیت سے لبریز ہیں۔ مثال کے طور پر 'ابھی تو نہیں مری نہیں'، نظم 'خودکشی' کا یہ بند دیکھئے ؎

ایک کمزور پل کو جو ٹالوں گے تم/ ٹھوکروں کی حقیقت کو جانو گے تم/ زندگی تم کو دے گی نئے واسطے/ محنتیں دیں گی تم کو نئے راستے/ زندگی خوب صورت نہیں نہ سہی/ گر جئے آپ اس کو سنوارو گے تم

یہی رجائیت، آشنا، احساس ''صبح امید''، ''تغیر'' اور اس قبیل کی کئی دیگر نظموں میں بھی ملتا ہے۔

جہاں تک صادقہ سحرؔ کی شاعری میں زبان وبیان کا تعلق ہے۔ وہ مسلسل طویل تخلیقی وشعری مراحل سے گزر رہی ہیں۔ کئی جگہ اوسط سے اسقام ضرور نظر آتے ہیں مگر ان سے قطعِ نظر اک قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ ان کی نظموں کے ڈرافٹ اور کرافٹ میں ہیئت اور مصرعہ آرائی میں کہیں بالکل معاصر نظم کا سا آب ورنگ ہے تو کہیں آدھونِک ہندی کویتا کا رنگ وروپ اور یہ امتزاج وافتراق موضوع اور خیال کے مطابقت کے تحت از خود ہوا ہے، جو بھلا سا لگتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی اور معنویت کی رو سے بھی۔ 'تہی داماں'، 'شیشوں کے شہر میں'، 'وہ ایک جہاں'، 'بھوکمپ'، 'وچن' 'چھوٹی سی دھرتی'، 'مایا'، 'فلیٹو زندگی'، وغیرہ اس مجموعے کی اچھی نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ راقم الحروف کی ادنیٰ رائے میں اس کتاب کی بہت اچھی نظمیں جس سے صرفِ نظر کیا جاسکتا۔ 'ایک بنتی' بھی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے احقر کے ذہن میں ساحرؔ لدھیانوی کے پرانے فلمی گیت کا مصرعہ ''وہ دنیا میرے بابل کا گھر یہ دنیا سسرال''، گونج سا گیا ہے۔ زندگی کے تجربے اور آگہی کو علامتی طور پر سسرالی رشتے داروں

کی دین بتاتی ہوئی یہ نظم اس کلائمکس کو پہنچتی ہے ۔

میرے سسرالی رشتے دار ہیں/تو کیا ہوا/ میرے لئے تو مائیکے کے رشتے داروں سے/ بدر جہا بہتر ہیں/ مائیکے کے رشتے نے مجھے/محبت دی، حفاظت دی/مگر انو بھو کہاں دیا؟

ہندوستانی معاشرے میں زندگی بسر کرتی ہوئی عورت کی جو محرومیاں اور نا کامیاں ہیں اور ان کے ردعمل میں اس کے مزاج میں جو کرب والم کا انجذاب ہے اور جس کا اظہار ہماری نسوانی شاعری کے بیشتر حصے میں ہے، وہ ظاہر ہے صادقہ کے حصے میں بھی آیا ہے۔ نظم ''آج اور کل'' کی یہ آخری سطریں ملاحظہ کیجئے ۔

میں جو اک جالا سا بنتی آئی ہوں/خواب کے سندر محل/ ہو گئے ویران سب/ امیدوں کا عکس دھندلا ہو گیا/ آج میرا دل امنگوں سے بھرا ہے/جانے وہ کل آئے گا کب/ جب کہ میرے حوصلوں کا اک کفن/ زیست پر لہرائے گا۔

''کھنڈر''، ''آنکھوں کی پیاس''،''بھیک''، ''اولاد''، ''کہاں ہے''، ''اپنی بانہیں'' وغیرہ نظموں میں بھی یہی معاملات متبادل صورتوں میں نظر آتے ہیں مگر ساری خوبصورتی اس بات میں ہے کہ صادقہ نواب سحر کے یہاں نسوانیت سمٹ کر عورت کی ذات تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ نسائی زاویہ فکر اور طرزِ احساس مختلف سطحوں پر پھیلتا ہے۔

صادقہ نواب کی شاعری میں جذبے کی صداقت، احساس کا ارتکاز اور پیشکش کا خلوص متاثر کرتا ہے۔ 'پتھروں کا شہر' مجموعے میں ان کا رائٹ اپ، حادثے سے اپجی کویتائیں، سادہ اور پیارا سا ہے۔ اصل مدّعا تو نظمیں ہیں۔ فن شاعری کا ایک تقاضہ 'اچھا کہنے' کا ہے تو ایک مطالبہ 'کچھ اپنا سا کہے' کا بھی ہے۔ سحر کے یہاں کچھ 'اپنا سا کہنے' کی پر خلوص دیانتدارانہ اور ایک حد تک کامیاب کوشش ضرور ہے جو یقیناً قابل قدر و تحسین ہے جو قارئین ہم عصر اردو شاعری اور سمکالین ہندی کویتا کا مشترکہ ذوق رکھتے ہیں۔ وہ اس شعری مجموعے ''پتھروں کا شہر'' کو ضرور ایک بامعنی اور خوب صورت سوغات جانیں گے۔

(۶ جنوری ۲۰۰۵ء)

صادقہ نواب سحؔر......تتلی،خوشبو،ستارہ رنگ فنکارہ

افتخار امام صدیقی
(مدیر شاعر ممبئی)

صادقہ نواب سحؔر کسی ایک صنف سے بندھی ہوئی فنکارہ نہیں ہے۔ شاعری ونثر کے تقریباً سبھی شعبوں میں اپنے تخلیقی کارنامے رقم کرتی رہتی ہے۔یوں تو کئی ایک خودبین ہمہ اصناف ہیں۔ ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، رفیعہ شبنم عابدی، بانو سرتاج، فاطمہ تاج، شفیقہ فرحت وغیرہ۔ان خواتین کے یہاں شاعری میں غزل، نظم، تنقید، طنز ومزاح، بچوں کا ادب سبھی کچھ ہے۔ صادقہ نواب نے بھی خود کو ہمہ وقت تخلیقی سمندر بنائے رکھا ہے۔ شاعری کے علاوہ بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور شاعری کرتی ہیں۔ دلت نظمیں بھی کہتی ہے، حالانکہ وہ دلت نہیں ہے، تاہم دلتوں کے مسائل سے بخوبی واقف ہے۔ دلت شاعر جینت پرمار کے بعد صادقہ کے یہاں نظموں کا لوازمہ وہ پچھڑی جاتی ہے جسے عام طور پر انوسوچت جاتی کہا جاتا ہے۔

صادقہ بیک وقت اردو اور ہندی میں لکھتی ہیں۔ وہ ہندی کی پروفیسر ہیں۔ طلبہ کو ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی بھی کرواتی ہیں۔ گھریلو ذمہ درایوں کے ساتھ ساتھ، مطالعہ اور گھر باہر سفارتی امور بھی صادقہ کی ذمے داریاں ہیں۔ان کے نصف بہتر نواب صاحب بھلے آدمی ہیں۔ اپنی ہم سفر کو ہر طرح کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ شہر کے ادبی پروگراموں، جلسوں، مشاعروں کی تقاریب میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ خوش قسمت صادقہ کو فخر ہے کہ اسے جیون ساتھی، ہم مزاج وہم خیال ملا ہے۔

میں اکثر نواب صاحب کی ڈھیروں تعریفیں کرتا ہوں تو صادقہ جواب دیتی ہے کہ ان کا احسان ہے لیکن پھر گفتگو کا محور تبدیل کر کے کہتی ہے:

"کیا کوئی اور موضوع نہیں ہے۔"

یہاں عورت کی پوری نفسیات ظاہر ہوتی ہیں۔

صادقہ کا ایک فخر اور بھی ہے کہ اس کا تعلق سیماب ادبی گھرانے سے ہے اور وہ اس پر ناز کرتے ہوئے راقم کو اپنا استاد تسلیم کرتی ہے، حالانکہ میں صرف مشوروں کی حد تک ہوں۔ وہ بھی موبائل پر جب بھی صادقہ کو کوئی ایوارڈ ملتا ہے تو فوراً فون پر اطلاع دیتی ہے۔ حال ہی میں ہندی نظموں کا مجموعہ "پتھروں کا شہر" پر سمستی پور (بہار) کی ایک ہندی سنستھا نے انھیں "راشٹریہ پرشکھر سمان" سے نوازا ہے۔

مجروح سلطان پوری مرحوم پر بھی صادقہ نے تحقیقی کام کیا ہے اور ہندی میں دو کتابیں "پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ" اور "لوک پریہ کوی مجروح"، سیمانت پبلیکیشر دہلی نے شائع کی تھیں۔ ہندوستانی پرچار سبھا (ممبئی) کی دو نصابی کتابیں ہندی میں بی اے اور انٹر کے لیے مرتب کی تھیں۔

منشی پریم چند پر ہندی میں دو کتابیں ادارے کے محمد حسن پر کار اور ڈاکٹر شیلا گپتا کے ساتھ مرتب کی تھیں۔ پہلا شعری مجموعہ "انگاروں کے پھول" شائع ہو چکا ہے۔ وہ ہندی غزل پر پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر چکی ہیں۔

یہ اجمالی تعارف ایک ہمہ جہت اور ہمہ صفات فن کارہ کے لیے ناکافی ہے۔ ان کے ایک اہم ناول کا ایک باب اس ذہین فنکارہ کے تخلیقی جوہر نمایاں کر لے گا۔ صادقہ نثر کے علاوہ شاعری بھی کرتی ہے۔ غزل و نظم کے اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

آؤ رشتوں کی آبرو بن جائیں — ایک روح کی جستجو بن جائیں
ہم سماں جائیں جسم و دل میں یوں — آپ سے تم اور تم سے تو بن جائیں
خود کو دیوار بنا کر دیکھا — ہم نے کس کس کو بچا کر دیکھا
اس کی یادوں میں سحر تھی گم سم — اس کی باتوں کو بھلا کر دیکھا

ایک نظم "آفس کی فائل" ملاحظہ کیجیے:

ایسا بھی ایک دن آئے گا/ روتے روتے ہنس کر میں /تم سے پوچھوں گی / سپنے سہانے /جو تھے دکھائے کہاں گئے /تم بھی شاید، چپ رہنے کا ناٹک کر کے /پچھلے لمحوں سے بچ لو گے /میں بھی آنسو پوچھ کے /بالوں کو سلجھا کر /دنیا کی گھما گھمی میں /آفس کی فائل میں، اپنے جل ڈھونڈوں گی

صادقہ کو چند صفحات میں کینوس کرنا مشکل ترین مصوری ہے۔ اسے تو اس مکمل گوشے میں سمونا بھی مشکل ہوگا۔ شاید مستقبل میں اس منفرد اور انعام واکرام سے مالا مال فن کارہ کو ''گوشہ گیر'' کرنے کی سعی کی جا سکے۔ صادقہ کو اردو اپنے عالمی قارئین کی دعائیں درکار ہیں۔ کسی کے ادبی کارناموں کو سراہانے میں دیر نہ کرنی چاہیے۔

(ماہنامہ شاعر ممبئی ستمبر ۲۰۰۷ء)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر کی غزل گوئی

پروفیسر میر تراب علی

بقول احمد ندیم قاسمی ''اگر کوئی فنکار اپنی تخلیقی کارگذاری پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے تو بس اطمینان کے ساتھ ہی اسے اپنی ادبی موت کا بھی اعلان کر دینا چاہئے۔''

صادقہ نواب سحؔر ایک زندہ، ذہین اور صاحب بصیرت تخلیق کار ہیں۔ انہیں ذوق تخلیق فراوانی سے ملا ہے جو اپنے اظہار کے لیے نئی نئی جہتیں تلاش کرتا رہتا ہے۔

جہاں تک ان کے افسانوی ادب اور دیگر تخلیقی کارناموں کا معاملہ ہے، یہ سب ایک دوسرے کے خلاء کو پُر کرنے والے ہیں۔ ان کا ادبی دربار اصناف ادب کے نورتنوں سے آباد ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر کا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' اردو شاعری کو ایک فکشن نو کا تحفہ ہے۔ انہوں نے پورے تخلیقی اعتماد کے ساتھ شاعری کے کوچے میں قدم رکھا اور شروع ہی سے اچھا تاثر قائم کیا ہے۔ ان کے پاس روایت کی پاسداری کے ساتھ تازہ کاری بھی ہے اور گردوپیش سے لگاؤ اور عصری شعور، نکتہ طرازی بھی، خوش مقالی بھی، ان کی شاعری غموں میں ڈوبی ہوئی اور زندگی کی تلخ سچائیوں اور ماضی کا عذاب لیے ہوئے کافی مہذب شاعری ہے۔

بقول ممتاز ادیب، دانشور اور نقاد ڈاکٹر سیدہ جعفر ''غزل کی کامیابی کا راز الفاظ کی خوبصورتی یا طرز اظہار کی لطافت اور رعنائی کی رہین منت نہیں ہوتی بلکہ اس کی آب و تاب معنی کے طلسم کی بھی آفریدہ ہوتی ہے''۔

صادقہ نواب سحرؔ کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

حق بولنا تو جرم ہے بازارِ دہر میں
گھر کر گئی یہ بات مرے دل کے شہر میں

....

شہر میں اس درجہ دہشت بڑھ گئی ہے دوستو
دل کی دھڑکن سے بھی ہم کو بارہا ڈرنا پڑا

....

آج زمانہ بدل چکا ہے کیسے جیئے گا کیا جانے
مجھ کو سحرؔ یہ انساں بالکل سیدھا سادہ لگتا ہے

ممتاز ادیب ونقاد ڈاکٹر فضیل جعفری نے کیا خوب کہا ہے:

''غزل نیم وحشی صنف سخن ہو یا نہ ہو لیکن ہم اپنے ثقافتی ورثے کو بھلا کر تین چوتھائی وحشی بن چکے ہیں اور رہی سہی کسر بھی جلد ہی پوری ہو جائے گی۔''

احمد فراز کے الفاظ میں:

یوسف نہ تھے مگر سر بازار آگئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آگئے

صادقہ نواب سحرؔ کا تہذیبی شعور ملاحظہ فرمایئے ۔

لمحوں میں انہیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے

آج ایک طرف مذہبی تعصب اور تنگ نظری کے اندھیرے اتر رہے ہیں تو دوسری طرف مفاد پرستی، خودغرضی اور نفسانفسی کا ہمالیہ سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ دولت کی ہوس لطیف احساسات کو ایسے بہائے لے جا رہی ہے کہ انسانی دردمندیاں بے معنی اور اجتماعی درد بے اساس ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدرؔ کے الفاظ میں:

خدا ہم کو ایسی خدائی نہ دے/ کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے

معاشرتی اقدار کا زوال، بدلے ہوئے انداز سے ظلم واستحصال، بے یقینی سے بھرے ہوئے حالات کو ہر اچھے اور سچے شاعر نے رد کیا ہے۔ سحر صاحبہ کا انداز دیکھئے ۔

پتھر صفت ہیں لوگ سبھی اس جہاں کے
لوگوں کو دل کے زخم دکھانے سے فائدہ

....

ہر ایک بات میں مطلب کا دخل ہوتا ہے
کسی کے کون یہاں غم گسار ہوتے ہیں

....

تعمیر کے پردے میں ہے تخریب کا جلوہ
تم کو ہی مبارک یہ ترقی کے اجالے

آخر میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کے الفاظ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

''صادقہ نواب سحر وہ شاخ گل ہے جسے شعور کی ہواؤں اور احساس کی نمو پا کر ابھی اور تازہ، شگفتہ اور سرسبز ہونا ہے۔''

('صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں (ناقدین کے تنقیدی اور تاثراتی مضامین سے انتخاب'؛ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، مدیران پروفیسر میر تُراب علی ید الٰہی، محمد اسلم نواب، ۲۰۱۷)

☆☆☆

قلم کی نواب۔صادقہ نواب سحؔر

نذیؔر فتح پوری

ممبئ اور پونے ہائی وے پر پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی ایک قدیم بستی ہے جس کا نام کھوپولی ہے۔کھوپولی کی وجہ تسمیہ کیا ہے، یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن جب پونے سے ممبئ کا سفر بس کے ذریعے ہوتا ہے اور شام کے وقت جب اس گھاٹ سے بس گذرتی ہے تو نشیب میں ایک بستی نظر آتی ہے۔روشن اور جگ مگ کرتی ہوئی۔رات میں یہ منظر نہایت دلفریب اور دل ونگاہ کو منور کرنے والا ہوتا ہے۔یہاں گھاٹ میں مختلف موڑ کی وجہ سے بس کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے اور میں بطور خاص بس کے روزن سے جھانک کر اس روشنی سے بھرے پورے منظر سے حظ اٹھاتا ہوں۔گھاٹ اور پہاڑیوں پر مکمل اندھیرا، ایسے میں درمیان میں یہ بستی روشنی کا جزیرہ معلوم ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے بہت سارے ستارے اور چراغوں کے ساتھ بے شمار جگنو یہاں مل کر روشنی کی گنگا بہا رہے ہیں۔زرد، سرخ اور سفید روشنی اپنی جدا جدا شناخت رکھنے کے باوجود ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اجالوں کی ایک کائنات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔یہاں سے گزرتے وقت میرے ذہن میں اجالوں کے بے شمار جگنو لہرانے لگتے ہیں اور میرے تصور کی مقناطیسیت اس وادی میں ایک ایسی شخصیت کو تلاش کرنے لگتی ہے جس کا قلم ان دنوں اجالوں کا حاتم بن کر تخلیقی جگنوؤں کی سوغات چاروں طرف تقسیم کر رہا ہے۔

اس روشن بستی کی واحد تخلیقیت پرور شخصیت کا نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحؔر ہے۔درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ صادقہ نواب سحؔر شاعرہ ہیں۔کہانیاں بھی لکھتی ہیں، تنقیدی اور

تخلیقی میدانوں میں بھی آپ نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ گذشتہ سال آپ کا ایک ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' منظر عام پر آیا۔ جس کا ادبی حلقوں میں خاطر خواہ استقبال ہوا ہے۔ ناول پر میں گفتگو مضمون کے اختتام پر کروں گا، پہلے صادقہ نواب سحر کی شاعری پر کچھ بات ہو جائے۔

صادقہ نواب سحر نے جب سے تخلیقی دنیا میں قدم رکھا ہے تب سے ان کا نام چرچے کا باعث رہا۔ ظاہر ہے پہلے انھوں نے شاعری ہی کو اپنی فکر کا مرکز اور ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ آپ کا شعری مجموعہ '' انگاروں کے پھول'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تو آنجہانی کالی داس گپتا رضا نے ''حرف چند'' کے تحت لکھا تھا:

> ''پہلی بات تو ہے زبان کی سلاست، پورا مجموعہ پڑھ جائے اضافت نام کی کوئی چیز شاذ ہی ملے گی۔ رواں دواں لفظ ایسے کہ زبان سے پھسلے جا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بیشتر غزلوں کے لیے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ایک عورت کو ہر طرح زیب دیتی ہیں۔''

(انگاروں کے پھول۔ از کالی داس گپتا رضا۔ صفحہ نمبر ۱۲۔۱۳)

ہر شاعرہ کی طرح صادقہ نواب سحر کے یہاں بھی نسوانی احساسات پائے جاتے ہیں۔ لیکن بقول رفیعہ شبنم عابدی:

> ''صادقہ کی شاعری میں اپنے عہد کی دیگر شاعرات کی طرح نسوانی جذبات و احساسات کی عکاسی ملتی ضرور ملتی ہے۔ مگر خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے اپنی شاعری پر آزادئ نسواں اور حقوق نسواں کے نام نہاد نعروں کا لیبل چسپاں نہیں ہونے دیا۔ جو آج ہر شاعرہ کے یہاں ایک فیشن کے طور پر چل پڑا ہے۔ صادقہ عورت ہے اور عورت ہی رہنا چاہتی ہے۔''

(انگاروں کے پھول، صفحہ نمبر ۸)

صادقہ نواب سحر کی شاعری میں بغاوت نہیں بلکہ تعمیر کا جذبہ نظر آتا ہے۔ وہ اخلاق

کے حدوں میں رہ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ان کی شاعری میں زندگی کی مثبت قدروں کا تحفظ نظر آتا ہے۔ایک مشرقی خاتون کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی شادی کسی اچھے گھرانے میں ہو، اسے ایک باوفا شوہر ملے اور اس کا ایک خوبصورت گھر ہو جہاں سکھ، آرام کرے اور خوشیاں جھولا جھولیں۔یہی تمنا صادقہ نواب سحؔر کی شاعری میں کروٹ لیتی نظر آتی ہے۔

میں عورت ہوں یہ فطرت ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں
روایت سے سحؔر رشتہ ہے میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

شاعرہ کی خوش بختی ہے کہ اس کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا ہوا ہے۔اس کا اظہار ''انگاروں کے پھول'' کے انتساب کے صفحے پر ان الفاظ میں درج ہے:

''اسلم نواب کے قدموں میں''

''تو میرا خواب ہے تو ہی میری حقیقت''

جب خواب حقیقت بن جاتے ہیں تو زندگی میں استحکام اور استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔شادی کے بعد نواب اسلم نے صادقہ سحؔر کی تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں جو اہم رول ادا کیا ہے، اس تعلق سے کالی داس گپتا رضا لکھتے ہیں:

''ایسا نیک اور مددگار شوہر پانے پر صادقہ کو میری دلی مبارک باد''

یہاں صادقہ نواب کا شاعرانہ تبصرہ بھی کچھ کم معنی خیز نہیں ہے۔ایک شعر ملاحظہ کریں:

گھر بسانا جو تصور تھا مر
بس اسے دل میں بسا کر دیکھا

بقول رفیعہ شبنم عابدی:

''وہ ایک سعادت منداور فرماں بردار بیوی بنے رہنے میں خوشی محسوس کرتی ہے

اور کہیں بھی اپنے رفیقِ حیات کے حکم سے سرتابی نہیں کرتی۔''

تمہاری رضا میں ہماری رضا ہے/ جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں/آپ کا حکم فرض ہے مجھ پر/ بولئے مجھ کو حکم ہے اب کیا!

یہ احساس وارفتگی، یہ جذباتی پیوستگی، یہ دعوتِ دل بستگی اور یہ تخلیقی شستگی ہی شاعرہ کو ایسا شعر کہنے کے لیے مہمیز کرتی ہے۔

اگر کہو تو خوشی سے میں ان کو سہہ لوں گی
وہ درد کون سے ہیں جو تمہیں ستاتے ہیں

صادقہ نواب کا تخلص ''سحرؔ'' ہے۔لغت میں اس کے معنی صبح کے بتائے گئے ہیں۔ایک غزل میں تخلص کو معنویت عطا کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں۔

بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے
اے سحرؔ روشنی رہی مجھ میں

یہ حقیقت ہے کہ سحر ہوتے ہی چراغوں کو بجھا دیا جاتا ہے۔ جب سحر سپیدہ نور سے نمودار ہوتی ہے تو کرۂ ارض پر اجالوں کی چادر بچھا دیتی ہے۔شام ہونے تک دنیا اس روشنی سے مستفیض ہوتی رہتی ہے۔زندگی کی ایک بڑی سچائی دو مصرعوں میں اجاگر کردینا شاعرہ کی فنکاری کا کمال ہے۔اس شعر میں ایک سبق بھی ہے۔''چراغ'' کمزور اور ناتواں لوگوں کا استعارہ ہے۔سحر جیسی طاقتِ وسعت رکھنے والوں کو چراغ جیسے ٹمٹماتے اور لرزتے لوگوں سے بے سبب نہیں لڑنا چاہئے۔سارا سب کچھ نہ سہی تو کچھ نہ کچھ ہر شاعر کے یہاں منفرد احساس پایا جاتا ہے۔صادقہ سحرؔ کے یہاں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جو ان کی انفرادی سوچ کے حامل ہیں۔ایک شعر ملاحظہ کیجئے۔

رہِ حیات میں مشکل سے خوف مت کھانا
کسی مقام پہ غم دو گھڑی تو سو لے گا

اور جب غم دو گھڑی کے لیے سوجائے گا تو خوشیوں کا کارواں سرعت کے ساتھ آگے نکل

جائے گا لیکن خوشی کے اس کارواں میں شامل لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے شاعرہ کہتی ہیں ؎

سنبھل کے چلئے محبت کے راستے میں ذرا ریہاں پہ ایک خوشی غم ہزار ہوتے ہیں

خوشی اور غم کے اجالوں اور اندھیروں سے گندھی صادقہ سحرؔ کی غزلوں کے بعد ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو نظموں کا کینوس زیادہ وسیع اور رنگارنگ نظر آتا ہے۔ نظموں کے باب سے جستہ جستہ گزرتے ہوئے ان کی ایک نظم ''تغیر'' نے دامنِ دل کھینچ لیا۔

موجودہ سیاسی معاشرتی اور سماجی حالات کی عکاسی اس نظم میں بدرجۂ اتم موجود ہے:

جفا دشمنی اور حسد کے دیئے/ زمانے نے ہر گام روشن کیے/ یہ نفرت کی بھٹی میں جلتے ہوئے من/ ملے ہر جگہ راہ زن/ ہر اک موڑ قاتلوں کی حکومت/ یہ دنیا ہے یا کوئی مقتل/لہو اس جگہ اتنا ارزاں ہے کیوں/ مری آرزو ہے/ وفا، دوستی اور ایثار کے/ میں جلا دوں دیئے/ آج سب کے لیے/ میں ہر دل کو خوشیوں کی سوغات دوں/ زمیں خشک ہے اس کو برسات دوں

''انگاروں کے پھول'' میں کچھ پابند نظمیں بھی ہیں۔ ''سوال''، ''پتھروں کا شہر''، ''کھنڈر''، ''گذارش'' ایسی نظمیں ہیں، جن میں آدمی کا دکھ، انسانیت کی پکار اور حالات کی سفاکی کے عکس صاف نظر آتے ہیں۔ یہ نظمیں شاعرہ کی دلی دردمندی اور عالمِ انسانیت کے لیے ان کی محبت اور ایثار کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہیں۔ شاعری کی دنیا میں اپنے روشن نقوش اجاگر کرنے کے بعد جب صادقہ سحرؔ نے ناول نگاری کی وسیع وعریض دنیا میں قدم رکھا تو احساس کے جگنوؤں نے چاند اور سورج کی صورت اختیار کر لی۔ پہلا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء نے کہانی سنانے کے لئے لب کھولے تو سناٹے کا دل چیر کر خاموشی کی جھیل میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ موج در موج داد و تحسین کے جلترنگ بج اٹھے اور چاروں اور سے بلند ہونے والی تحسین آمیز لہر نے سماعتوں کو سیراب کر دیا۔ ایک سال کا عرصہ گزر چکا یہ ناول ہنوز چرچوں میں ہے۔ خصوصاً ممبئی کے ادبی حلقوں میں اس ناول کی گونج رہ رہ کر سنائی دے رہی ہے۔ صادقہ سحرؔ اپنے اس ناول سے بہت خوش ہیں لیکن داد و تحسین کے اس امنڈتے طوفان میں انہوں نے اپنے ظرف کی کشتی کو بے قابو ہونے نہیں دیا۔ چپوں اور

بادیاں دونوں کو انھوں نے اپنے ہاتھوں سے مضبوط تھام رکھا ہے۔ یہ کشتی آج بھی ان لہروں کے سینے پر ہلکورے لیتے ہوئے خراماں خراماں اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ جب بھی کسی ادبی محفل میں ان سے ملاقات ہوتی ہے، کسی نہ کسی بہانے گفتگو کا زاویہ ایسا نکل ہی آتا ہے جو ان کے ناول پر مرکوز ہو جاتا ہے۔

''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' آخر کیا ہے؟ کون کس سے کہانی سنانے کی فرمائش کر رہا ہے۔ ناول میں اول سے آخر تک کیا ہے۔ اس کا اندازہ تو ناول پڑھنے کے بعد ہی آئے گا۔ افتخار امام صدیقی نے اسے کہانیوں سے بنا ہوا ناول قرار دیا ہے۔ محمود ایوبی نے اسے اشاروں سے نفسیات گتھی سلجھانے والا ناول تسلیم کیا ہے۔ سلام بن رزاق کے نزدیک یہ ناول اپنے اندر ایک دبی دبی سی کسک کا احساس رکھتا ہے۔ وہ کسک جو قاری کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس ناول کا مطالعہ کیا۔ مصنفہ نے ضمنی عنوانات دے کر کہانی کی اکائی کو بہت سے روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک دلچسپ انداز ہے کڑی سے کڑی جڑ کر جب زنجیر بنتی ہیں تو ۲۲۴ صفحات تک یہ سلسلہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ یہ مصنفہ کی اسلوب نگارش کا کمال ہے۔ یہی ہنر مندی اس ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مطالعہ کے دوران بہ ظاہر تسلسل ٹوٹنے کے بعد بھی بہ باطن باقی رہتا ہے۔ ناول میں جگہ جگہ ''عورت'' پر ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کی روداد ملتی ہے، مثلاً ایک جگہ لکھا ہے:

> ''میں اپنی نند کے دیور کی شادی میں بھی شریک ہوئی تھی۔ لڑکا کنوارا تھا۔
> لڑکی کے ڈیڑھ سال کے دو جڑواں بچے تھے اور یہ کوئی محبت کی شادی نہیں تھی۔
> گوتم سماج کی عورتوں کے ساتھ برتاؤ میں میرا سر جھک جاتا ہے لیکن باقی دنیا کو
> ایسا کب بھا سکتا ہے۔ باقی سماج کے لیے بیوی مر جائے تو شوہر منحوس نہیں لیکن
> شوہر مر جائے تو بیوی اشبھ، چنڈال، اپنی لوناولہ والی سہیلی کے پتی مرنے پر
> پڑوسنوں اور رشتہ داروں نے مل کر اس کی کانچ کی چوڑیاں تڑوا دی تھیں۔ یعنی
> گھاؤ پر نمک نہیں مرچ مسالہ بھی ہوا۔'' (صفحہ نمبر ۱۷۲)

ہر فطری فنکار کے یہاں ایک ازلی بے چینی اور اپنے فن کے تئیں ناقدری کا احساس موجود ہوتا ہے۔ یہ آ گہی اسے شعلوں پر لٹاتی رہتی ہے۔ غالب اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں:

''خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ان باون برسوں میں اس نے کس قدر معنی کے دروازے مجھ پر کھولے ہیں اور میری فکر کو کس قدر بلندی بخشی ہے۔ مگر افسوس کہ لوگوں نے میرے کلام کی خوبی کو نہیں سمجھا۔''

ممکن ہے اپنے اس ناول سے متعلق صادقہ سحرؔ کو بھی یہی بے چینی اور ناقدری کا احساس ہو؟ اور ہونا بھی چاہیے۔ فنکار جس کرب اور ذہنی اضطراب کے دور سے اپنی تخلیق کی ترسیل کے وقت گزرتا ہے، اس کا احساس کوئی قاری یا نقاد نہیں کر سکتا۔ ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' میں مصنفہ صادقہ نواب سحرؔ نے جتنے کرداروں کے ساتھ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا ہے، ان سب کے دکھ درد میں وہ برابر کی شریک رہی ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار کو اپنی شخصیت میں سمو کر جو اذیت مصنفہ نے جھیلی ہے اس کی داد کون دے سکتا ہے۔ جو کرب، جو کشمکش، جو ذہنی بکھراؤ اس کردار کے بطن سے پھوٹا ہے، اس کا علاج معاشرے میں کس کے پاس ہے۔ ''میں کہاں جاؤں؟؟ میں نے پیشانی زمین پر ٹیک دی اور کہا، کہاں جاؤں''، ''دھرم کیا ہے؟ خدا تیرے اتنے نام کیوں ہیں۔'' ہر اکائی پسند فنکار کے سامنے ایک دن یہ سوال ضرور اٹھتا ہے۔ ''خدا تیرے اتنے نام کیوں ہے۔''

جتنے نام ہیں اتنے ہی پرچم ہیں۔ جتنے پرچم ہیں اتنی ہی افواج ہیں۔ جتنی افواج ہیں اتنی ہی جنگیں ہیں۔ ''خدا تیرے اتنے نام کیوں ہیں؟ ''

صادقہ نواب سحرؔ نے افسانے کے بطن سے بھی اپنی تخلیقی توانائیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ افسانے انسانی زندگی کے کرداروں کے اردگرد رقص کناں نظر آتے ہیں۔ عام انسانوں کے دوش بدوش خواص کی زندگیوں کی جھلک بھی ان افسانوں میں موجود ہے۔

صادقہ نواب سحرؔ نے تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ بھگتی دور کی معروف شاعرہ میراں پر ان کے دو مضامین زیر مطالعہ شمارے میں شامل ہیں۔ ان کا گہرائی

سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی ژرف نگاہی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ سر اور سنگیت میں درک رکھتی ہیں، لے اور تال سے بھی ان کو آگہی ہے۔

اردو میں خواتین ڈرامہ نگاروں کا نام بہت کم مطالعہ میں آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کی زندگی ہر شعبے میں ڈرامہ کرنے کا حق مردوں نے اپنے نام لکھ رکھا ہے۔ سیاست ہو، سماجیات ہو، مذہب ہو، چوک ہو، چوپال ہو، گھر کی چار دیواری ہو، ہر جگہ مرد ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔ تحریری طور پر صادقہ سحؔر نے ڈراموں کی اسکرپٹ بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ یہ ڈرامے ہنوز زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ ممکن ہے اسکول اور کالج کے طلبا و طالبات نے مل کر ان ڈراموں کو جیتے جاگتے کرداروں میں پیش کیا ہے۔

ایک تجربہ کار قلم سے نکلی ہوئی یہ مکالماتی تحریر اپنے آپ میں دلچسپ، مربوط اور دامن میں کھینچے والی ہے۔ ان کے بارہ اسٹیج ڈراموں کی کتاب ''مکھوٹوں کے درمیان'' ادیبوں میں مقبول ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تخلیقی ہنر مندیاں آپ کے قلم سے صفحہ قرطاس کی زینت بنی ہیں۔ ان تمام کی سمائی اس مختصر مضمون میں نہیں کی ہو سکتی۔

دعا ہے کہ آپ کا قلم ادب کی ساری سمتوں میں اپنی رفتار اور معیار کے ساتھ سرگرم سفر رہے اور تخلیقی دنیا میں مسلسل تاریخ رقم کرتے ہوئے تزک و احتشام کے ساتھ اپنی نوابی کا پرچم لہراتا رہے۔

(اسباق، پونہ، مہاراشٹر، اکتوبر ۲۰۱۰ تا مارچ ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

صادقہ نواب سحر کی نظم نگاری

رفیق جعفر

صادقہ نواب سحر آج کے اردو ادب کا چمکتا دمکتا نام ہے۔ نثر، فکشن اور شاعری میں ان کا ایک مقام ہے۔ گو کہ یہ عرصے سے لکھ رہی ہیں لیکن موجودہ دہے میں ان کا نام ابھر کر سامنے آیا ہے۔ تدریسی پیشے کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے گھریلو فرائض انجام دیتے ہوئے کسی خاتون کا ادب کی خدمت کے لیے وقت نکالنا بہت مشکل کام ہے لیکن صادقہ کے ذوق اور وقت کے صحیح استعمال کے ہنر نے اس مشکل کو آسان بنا دیا ہے۔ یہ نہ صرف لکھتی ہیں بلکہ ان کی تخلیقات اردو اور ہندی کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی کتابیں بھی شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے علاوہ ادبی اور تعلیمی سمیناروں میں بھی بلائی جاتی ہیں۔ تقریر و تحریر میں ماہر صادقہ ایک فعال خاتون ہیں۔ ادب شناسی حلقوں میں جانی مانی جاتی ہیں، صادقہ کے سارے ادبی کاموں کا احاطہ سرسری طور پر کرنا ناانصافی ہوگی اس لیے ہم نے یہاں صرف ان کی نظم نگاری پر گفتگو کرنا مناسب سمجھا ہے۔

صادقہ کی نظم نگاری کی عمر اتنی ہی ہے جتنی کہ ان کے لکھنے کی عمر ہے۔ گو کہ یہ غزلیں بھی لکھتی ہیں لیکن ان کے شعری صلاحیتوں کے جوہر نظم میں مؤثر طریقے سے کھلتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے آزاد نظموں کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ جب کہ کچھ پابند نظمیں بھی لکھی ہیں۔ گیت بھی لکھے ہے اور دوہے بھی۔ ہمیں ان کے آزاد نظموں میں کشش نظر آتی ہیں۔ کیونکہ یہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں، وہ آزاد نظموں میں سلیقے سے کہہ گزرتی ہیں اور

ان کی نظموں میں روزمرہ کی زندگی کے مشاہدے اور تجربے کی کچھ ایسی باتیں ہیں جو قاری یا سامع کو اپنی ہی باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ان کی کچھ نظموں کے موضوعات تو ایسے ہیں جو قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور قاری سوچتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔

صادقہ کی ایک نظم ''وہ بھی ہنستے ہیں'' یہ نظم جھونپڑوں میں رہنے اور بسنے والے لوگوں زندگی کا حال بیان کرتی ہیں جن میں عورتیں بھی ہیں، مرد بھی اور بچے بھی ہیں اور پالتو جانور بھی۔اس نظم کی بنیادی سوچ ایک پڑھی لکھی عورت کی ہے کہ وہ اس ماحول میں رہنے والوں کے بارے میں تعجب اور ہمدردی سے سوچتی ہے اور دنگ رہ جاتی ہے کہ ان غریبوں میں بھی خوشی ہے، یہ بھی ہنستے ہیں جبکہ وہ وہ لوگ ہے جن کے ساتھ دکھ پلتا ہے اور مسلسل ناانصافی ہوتی رہتی ہے۔ان کے بچے بلکتے ہیں اور ترستے ہیں لیکن ایسے حالات میں بھی وہ سکھ اور خوشی ڈھونڈ لیتے ہیں۔شاعرہ کی اس نظم کا مرکزی خیال سبق آموز ہے۔

ایک نظم ہے ''دنیا کھیل تماشہ'' یہ نظم غریب عورتوں کی زندگیوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں بہت ہی خوبصورتی سے ان کی زندگیوں کے منظر کو درشا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے طور پر جو بھی جیسی بھی زندگی ملی ہے، اسے انھوں نے سویکار کیا ہے اور اپنی دنیا میں مگن ہیں۔انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ لوگ ان کے جیون کو کھیل تماشا سمجھیں یا کچھ اور، موجودہ زمانے میں اپنے سوا کسی اور کے بارے میں اور وہ بھی ہمدردی سے سوچنا انسانیت کی اعلیٰ قدروں میں آتا ہے۔یہ کام فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے فنکار ہی کر سکتے ہیں۔ اسی سے ان کے فن کو جلا ملتی ہے اور ایسا کر کے ہی ان کے دلوں کو سکون ملتا ہے۔فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں ہم اس کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے، یہ باتیں منظّم طریقے سے شعر میں ڈھلتی ہیں اور شاعری میں ایک قسم کی جاذبیت ہوتی ہے جو قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

صادقہ نواب سحؔر جس صنف ادب میں کام کر رہی ہیں، اس کا ایک خاص وصف ہوتا

ہے۔عام زندگی کے رنگ، عام آدمی کے ایسے مسائل جو دنیا سے چھپے رہتے ہیں، وہ صادقہ کی تخلیقات سے نمایاں اور روشن ہو کر زندگی کی تصویروں میں ڈھل جاتے ہیں اور محفوظ ہو جاتے ہیں۔صادقہ کی نظموں میں بھی وہ تلخ گھناؤنے اور الجھے ہوئے مسئلے نظر آتے ہیں جن کا اظہار متفکرانہ اور ہمدردانہ ہوتا ہے۔ایسی نظموں میں صادقہ کا شخصی کردار جتنا بلند نظر آتا ہے،اس سے بلند ان کا اندرون نظر آتا ہے۔وہ جو سوچتی ہیں، محسوس کرتی ہیں، اسے ان کا قلم بوند بوند ٹپکا کر قرطاس پر نقش و نگار بنا دیتا ہے۔صادقہ نے کئی چھوٹی چھوٹی نظموں میں بڑے بڑے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے جیسے ایک نظم ''بلاتکار'' میں ووٹ بٹورنے والوں سے اچھوتوں کی پیڑا کے بارے میں وہ سوال کرتی ہیں؟''امبیڈکر وادی ادب'' نامی نظم میں دلت ادب کو برا بھلا کہنے والوں پر طنز کرتی ہیں۔ایک نظم ''دھرم سنکٹ'' میں وہ کہتی ہیں: سنا آپ نے/دھرم پریورتن کیے ہوئے/غریبوں کا شدی کرن/کیا جارہا ہے/انھیں دوبارہ دلت بنایا جارہا ہے/کہتے ہیں سنکٹ کا سمے ہے/اکیسویں صدی میں/جی چاہتا ہے/پوچھ ہی لیں/کیا سچ مچ مذہب خطرے میں ہے؟

صادقہ کی نظموں کا کوئی ایک موضوع جو ایک سوال سے شروع ہوتا ہے جواب نہ ملنے پر دوسرا سوال کھڑا کر کے چپ ہو جاتا ہے اور قاری من ہی من میں بولنے لگتا ہے، یہ نظم کی خاص خوبی ہے، ایسی خوبیاں صادقہ کی نظموں میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔یہ شاعرہ کی فنی سوچ کا عمل ہے کہ ان کی نظمیں مسئلہ کو حل پیش نہیں کرتیں، آئینہ دکھاتی ہیں،لفظوں کا چناؤ اور خیالوں کا کساؤ صادقہ کی نظموں کا خاصہ ہے، صادقہ کی یہ نظمیں قاری کو کسی الجھن میں نہیں ڈالتیں، غیر ضروری باتوں نہیں الجھاتیں، سیدھی بات کہہ جاتی ہیں۔اس سلسلے میں صرف ایک نظم کی ابتدائی چند سطریں ملاحظہ کریں۔اس سے صادقہ کے طرز سخن کا اندازہ ہو جائے گا:

''جب پتہ چلا/جھونپڑپٹی کی اس لڑکی کا/رشتہ طے پایا ہے/جب پتہ چلا/دل میں اک ہوک جگی/جانے کیوں چوٹ لگی/دل کیوں بھر آیا/جب پتہ چلا/جو سارے محلے میں/سب سے تیز تھی''

صادقہ کے کچھ نظموں میں معاشرے کی کچھ ایسی ننگی حقیقتیں ہیں جو خود سے شرماتی نظر آتی ہیں۔اس پر صادقہ سوال کا بم شل داغ دیتی ہیں۔ چھوت چھات کے موضوع پر صادقہ کی نظم ملاحظہ فرمائیں،عنوان ہے ''دلت مسلمان'':

''میری پڑوسن / ہر دیوالی پر / مجھے مٹھائی کھلاتی ہے / مگر عید پر بھیجا ہوا / میرا شیر خورمہ / اپنی نوکرانی کو دے دیتی ہے / جب بھی میرے گھر آتی ہے / میرے ہاتھوں کی بنی چائے نہیں پیتی / مگر بازار سے منگوائی / کولڈ ڈرنک / سیدھے بوتل سے پیتی ہے / مجھے احساس ہونے لگتا ہے / میرا سلسلہ وہ کہاں سے ملاتی ہے / کیا وہ میری ابتداء میں / تبدیلی مذہب کے فلسفے کو دیکھتی ہے / یا مجھے دلت مسلمان سمجھتی ہے / تعلیم میں تہذیب میں / ہر بات میں / کیا میں گئی گذری ہوں۔

تبدیلی مذہب دل سے بھی ہوتی ہے، چہرے سے بھی اور مجبوری سے بھی۔اچھوتوں کے دھرم پریورتن اکثر مجبوری پر منحصر ہوتے دیکھے گئے ہیں۔صادقہ نے ایک نظم بڑی تیکھی کہی ہے۔ملاحظہ فرمائیں، نظم کا عنوان ہے ''اگلی پیڑھی'':

''سنا / دلتوں کے ایک پورے گاؤں نے / دھرم پریورتن کرلیا / پوچھا تو کہا / ہمیں نہ سہی / ہماری اگلی پیڑھی کو / اس کا فائدہ ضرور ہوگا / کم سے کم وہ تو اچھوت اور / چھوٹی ذات / نہیں کہلائے گی۔''

کڑوے سچ کی حساس شاعرہ صادقہ کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ ایسے موضوعات جو ان کے افسانوں، ناولوں، غزلوں، ناٹکوں میں کسی وجہ سے جگہ نہیں پا سکے، انھیں یہ نظم کے پیکر میں ڈھال دیتی ہیں اور مطمئن ہو کر نئے موضوعات کھوجنے لگتی ہیں۔ یہ فنکارانہ جنون صادقہ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا، بے چین کرتا رہتا ہے۔اپنے جیون کے کچھ لمحوں کا بلیدان کر کے وہ اپنی رچنا کے لیے کیسے وچار کر لیتی ہیں، وہ ہی جانے قاری کیا جانے لیکن قاری کا فائدہ یہ ہے کہ اگر وہ صادقہ کی کویتا کے ساتھی سنگی بن جائے تو صادقہ جو جیون درشن کروائے گی، اس کا سنگی یاتری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ جیون کے ایسے

ٹیڑھے میڑھے راستے بھی ہیں۔ کیا جیون کا چہرہ ایسا بھدا بھی ہوتا ہے لیکن اس منزل پر پہنچنے کے لیے صادقہ کے لہجے کو سمجھنا ہوگا۔ ہندی آمیز اردو کا گیان رکھنا ہوگا اور صادقہ کے جذبۂ صادق کی قدر کرنی ہوگی، اس کی بات کو اہم جاننا ہوگا۔ بات کہنے کے جذبے کو سمجھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے وہ جو یہ سب کچھ کرے گا وہ صادقہ کو ہندی اور اردو کی اچھی شاعرہ مان ہی لے گا۔

(اسباق، پونہ، مہاراشٹر، اکتوبر ۲۰۱۰ تا مارچ ۲۰۱۰ء)

'ڈاکٹر صادقہ متاشا کی طرح ایک حوصلہ مند عورت'

فرحان حنیف وارثی (ممبئ)

شہرِ ممبئ کی جن خواتین قلمکاروں نے قومی سطح پر اپنی پہچان قائم کی ہے، ان میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا نام سرِ فہرست ہے۔ موصوفہ اردو کے علاوہ ہندی کے ادبی حلقے میں بھی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک کہانی کار، شاعرہ، ڈرامہ نگار، مترجم، ناقد، محقق اور ناول نگار کے طور پر اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے۔ پروفیسر میر تراب علی کے بقول:

"ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی تخلیقات ظلم کرنے والوں اور ناانصافی کو اپنی عادت بنانے والوں کے ہاتھوں بچے ہوئے حسن اور خوبصورتی کے اثاثہ کی حفاظت سے عبارت ہے۔ ان کی تحریریں علم و آگہی، فہم و ادراک، محسوسات اور تفکرات کی آئینہ دار ہیں۔"

بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر بھی ادبی پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے ماموں شیخ فرید تیلگو کے معروف شاعر تھے اور 'فریسا'' کے قلمی نام سے جانے جاتے تھے۔ پرنانا مقدوم کا تخلص عاشق تھا اور وہ اردو میں شاعری کرتے تھے۔ ان کے والد اسی لیے انہیں قلمکار بنانے کی خواہش رکھتے تھے اور انہوں نے پالنے میں ہی ان کی صلاحیتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بتاتی ہیں:

"پانچویں کلاس میں میں نے اپنی سہیلی کے لیے ایک خط لکھا تھا جسے میری ٹیچر نے ایک نظم کی شکل میں دیکھا۔ یعنی شاعری کی سن گن کی پہچان ٹیچر نے کروائی تھی۔ بچپن سے ہی بچوں کو گھیر کر کہانیاں سناتی، خوب کہانیاں

نظمیں پڑھتی، پھر ناولوں سے بہت سیکھا۔ کم عمری میں ہی روزنامہ ''انقلاب''
سے لکھنے کی شروعات ہوئی۔ اسکول ختم کرتے ہی اسٹیج، دوردرشن اور پرنٹ میڈیا
کا دامن تھاما۔ شاعری اور نثر جو بھی لکھا، سہیلیوں اور قارئین نے پسند کیا۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کو بشریٰ رحمٰن، رضیہ بھٹ، مسرور جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے کافی متاثر کیا اور مطالعے کی اس لگن نے انہیں آگے چل کر ایک مشاق قلمکار بننے میں معاونت کی۔ حقانی القاسمی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اس خوبصورت احساس کی حامل ہیں جو خزاں کو بھی
بہار میں بدل دیتا ہے اور ریگ زار کو بھی گلزار بنا دیتا ہے۔ وہ بہت مثبت اور تعمیری
ذہن رکھتی ہیں۔ ہر باب میں ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔ وہ گوکہ عملی طور پر ہندی
ادبیات سے وابستہ ہیں مگر اردو میں بھی ان کا ایک الگ مقام ہے۔ ایک فکشن
نگار، ڈرامہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے وہ اپنی الگ شناخت بنا چکی ہیں۔''

حقانی القاسمی کی تحریر کردہ یہ سطریں صداقت پر مبنی ہیں اور اس کا ثبوت ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ہے جو اردو، ہندی اور تیلگو کے علاوہ سرحد پار پاکستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ محمد متین ندوی ''انتساب'' (سرونج مدھیہ پردیش) میں رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا زیر تبصرہ ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا''
عورت کی قربانیوں کی داستان ہے۔ مرکزی کردار متاشا اپنوں اور پرایوں کی
بدسلوکیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ وہ ایک
حوصلہ مند عورت ہے اور زندگی کے نشیب وفراز کو اپنی زندگی میں بہ آسانی
ایڈجسٹ کر لیتی ہے۔''

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

''مواد اپنی ہیئت خود لے کر آتا ہے البتہ کچھ مسائل اظہار کے الگ

پیرائے مانگتے ہیں۔شائع ہوجانے کے بعد تحریر قاری کی ہوجاتی ہے،اپنی نہیں رہتی۔قاری کو پسند کرنے نہ کرنے کا پورا حق ہے۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا ایک اور ناول ''جس دن سے'' بھی موضوع بحث رہا ہے۔ نسترن احسن فتیحی ''جس دن سے'' کے بارے میں لکھتی ہیں:

''صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول ''جس دن سے' ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو رشتوں کے بحران کا شکار ہے۔صادقہ کو اپنے قلم پر پورا عبور حاصل ہے۔وہ اپنے الفاظ کے ذریعے معاشرے کی سچی اور صاف تصویر بنانے میں ماہر ہیں اور اس طرح کرداروں کی عکاسی کرتی ہیں کہ ان کرداروں کے احساسات اور جذبات کے سارے رنگ نمایاں ہوجاتے ہیں۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے ڈراموں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کے تحریر کردہ مشہور ڈراموں کی فہرست میں ''دیا جلے ساری رات''، ''ظلم تو ظلم ہے''، ''اور گھنگھرو بجتے رہے''، ''رنگ برنگا بھارت میرا''، ''ڈاکٹر کفن پھاڑ''، ''تین دو پانچ''، ''میرج بیورو'' اور ''ڈسکو کالج ممبئی'' جیسے ڈرامے شامل ہیں۔

ڈاکٹر شہناز صبیح لکھتی ہیں:

''یہ تمام ڈرامے سماجی اور نفسیاتی مسائل کے آئینہ دار ہیں جو کہ ڈرامہ نگار کی حساس طبیعت کو منکشف کرتے ہیں۔ڈاکٹر صادقہ انسانیت پر یقین رکھتی ہیں۔قلم کے ذریعہ عوامی خدمت کا حق ادا کرنا چاہتی ہیں۔عورت کی مظلومیت، مرد کا شراب نوشی کر کے پورے خاندان کو زندہ درگور کردینا، بچوں کے ارمان اور مایوسیاں، یہی وہ موضوعات ہیں جو کہ ان کے ڈراموں کے محرک ہیں۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے ڈراموں کے مجموعہ ''مکھوٹوں کے درمیان'' کو بھی سراہا گیا تھا۔ ان کے افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' کے بارے میں ڈاکٹر شباب ظفر اعظمی نے لکھا ہے:

''صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا موضوعاتی تعلق عورتوں کی زندگی،

رشتوں کی پامالی، قدروں کی شکست وریخت اور بہت تیزی سے غائب ہوتی ہوئی محبت ہے جس پر ہماری زندگی کا دارومدار تھا۔ وہ نت نئے انداز، نوع بہ نوع واقعات اور صورت حال کی مدد سے ان مسائل کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔"

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر بتاتی ہیں:

"جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے تب سے اپنے جسم کی ساخت اور سماج میں اپنی جگہ بنانے کے لیے عورت کو جدوجہد کرنی ہی پڑی ہے۔ یہ جدوجہد کئی پیمانوں پر ہوتی رہی ہے۔ انسانی ضرورتوں نے بہت بار عورت کو حدود میں باندھا ہوگا لیکن ہر دور میں اس نے یا اس کی ہم جنسوں نے کسی نہ کسی طرح یہ حدود پھلانگنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اس کام میں بہت بار مردوں نے اس کا ساتھ دیا ہوگا۔"

وہ کہتی ہیں:

"وجود کی لڑائی میں سماج مرد اساس بنا اور عورت اکثر بھلا دی گئی۔ پیدائش سے ہی نوزائیدہ لڑکے کو بھی بڑی اہمیت ملی۔ اسے کمانے والا، گھر بسانے والا اور محنت کرنے والا کہا گیا ہے، اس لیے سوسائٹی میں تعلیم، صحت اور انصاف کے معاملے میں عورت کو دوسرے درجے کی شہری جیسا درجہ ملا۔"

صادقہ نواب سحؔر نے شاعری کے میدان میں بھی پوری توانائی کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ ان کے اشعار میں نغمگی بھی ہے اور کھرا پن بھی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے انہیں ان جن تجربوں سے دوچار ہونا پڑا، اس کا عکس ان کی غزلوں میں جا بجا دکھائی پڑتا ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔ خصوصاً بچوں کے لیے کہی ہوئی ان کی نظمیں کمال کی ہیں۔

صادقہ نواب سحؔر کا قلم برسوں سے چل رہا ہے اور وہ بغیر تھکے متواتر لکھ رہی ہیں۔

ان کی تصانیف اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ موجودہ سماج اور حالات سے ڈر کر رکنے، چھپنے یا پردے میں بند ہوکر ہار ماننے والی عورت نہیں ہیں۔ انہیں دوسرے درجے کا شہری بن کر جینا پسند نہں ہے۔ وہ احتجاج کرنا بھی جانتی ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے ایم اے، پی ایچ ڈی (اردو)، ایم اے (انگریزی) اور ڈی ایچ ای سیٹ کیا ہے۔ وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ریسرچ گائیڈ کے علاوہ ایم سی کالج کھپولی (رائے گڑھ) کے شعبۂ ہندی کی صدر ہیں۔ انہیں ان گنت اعزازات اور انعامات سے نوازا جاچکا ہے جن میں ساحر لدھیانوی ایوارڈ (۲۰۰۴ء مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈیمی)، شکیلہ اختر ایوارڈ (بہار اردو ساہتیہ اکاڈیمی)، منشی پریم چند ایوارڈ (مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکاڈیمی)، یوا لیکھک پرکاشن سمان (بھارتیہ بھاشا پریشد کولکاتہ)، مولانا ابو الکلام آزاد ایوارڈ (مغربی بنگال اردو ساہتیہ اکاڈیمی) اور پروین شاکر ایوارڈ (اردو پریشد پونا) قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر ماریشیس، دبئی، جدہ، لندن، پیرس اور سوئزرلینڈ میں منعقدہ ادبی تقریبات میں شرکت کرچکی ہیں۔ ان کی نگارشات کا اردو اور ہندی کے علاوہ پنجابی، تیلگو، کنڑ، انگریزی، مارواڑی اور مراٹھی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے شوہر اسلم نواب کے بقول:

> ''صادقہ میری نہ صرف نصف بہتر ہیں بلکہ ان کی تخلیقات کا میں پہلا ناقد بھی ہوں۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے مطابق:

> ''میں اپنی تحریروں سے بڑی اُمید نہیں رکھتی۔ ہاں دیانتداری کے ساتھ لکھنا چاہتی ہوں۔ یہاں میری ایک عجیب وغریب خواہش بھی سن لیجیے۔ جی چاہتا ہے، کسی کو نظر نہ آؤں۔ صرف میری تحریریں بولیں۔''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی یہ خواہش پوری ہوئی مگر اس عجیب وغریب خواہش کے پایۂ

تکمیل تک پہنچنے کا مجھے کوئی امکان نظر نہیں آتا، کیونکہ متاشا کی طرح انہیں بھی قارئین، سامعین اور ناظرین پڑھنے، سننے اور دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔انہوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ لکھا ہے اور اس لیے اردوداں طبقے کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔)

(روزنامہ ممبئی اردو نیوز، ممبئی، ۱۵مارچ ۲۰۱۸ء)

غزل کی شاعرہ: صادقہ نواب سحر

سوریہ بھانو گپت

ہمعصر شاعری میں جدیدیت کے نام پر جان بوجھ کر پیدا کئے جانے والے ابہام اور مشاعروں اسٹیجوں کی ڈانس بار جیسی پھوہڑتا سے اُپجے readability کے خالی پن کو بھرنے کا کام ہندی میں غزل نے بڑی آسانی سے کیا ہے۔غزل اوپر سے دراصل آسان سی لگنے والی ایک ایسی مشکل ترین صنفِ شاعری ہے جو منجھنے سے پہلے کڑی محنت، مسلسل مشق اور بے انتہا صبر طلب کرتی ہے، لہٰذا اس نظریے سے ڈھونڈنے بیٹھئے تو مشکل سے بیس پچیس تخلیق کار ہی ایسے ملتے ہیں جنہوں نے بھرتی کے غزل گوشاعروں کی بھیڑ کے درمیان سچ مچ صحیح معنوں میں غزلیں کہی ہیں اور اپنی پہچان قائم کی ہے۔اب اس فہرست میں صادقہ نواب سحرؔ کا نام بھی اپنی پہچان بننے کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔

ان کی غزلیں ٹھیٹھ اردو محاورے میں رچی بسی ایسی رومانی غزلیں ہیں، جن کی شعری روایت سے ہندی کا قاری اچھی طرح متعارف ہے۔دیش اور دنیا کے ہم عصر بھیانک حالات، حالیہ ٹیکنالوجی کے اسٹیل فریم میں جڑی زندگی، ورگ گت سماجی اونچ نیچ اور دھرم اور ذات پات پر منحصر سیاسی جوڑتوڑ سے اپجے حالات کی چھٹ پُٹ فکروں کے علاوہ اپنے گھر پریوار اور سماجی ماحول سے حاصل کردہ کڑوے کسیلے تجربوں کی کچھ اڑتی ہوئی گونج بھی اس مجموعے میں ضرور سنائی دیتی ہے مگر شاعرہ سحرؔ کے تخلیقی سروکاروں کی اصلی زمین یا مرکز خاص طور سے عشق اور اس کے مختلف رنگوں کے سکھ دکھ ہی ہیں، جن میں سکھ کا حصہ برساتی دھوپ کی طرح نہایت کم اور دکھ کا سردیوں کی راتوں سا بے حد لمبا ہے اور ایک گہری اداسی

کی شکل میں بار بار سامنے آتا ہے۔

محبت کی یہ اداسی گہری سے دھیرے دھیرے گاڑھی ہوتی ہوئی پختگی کی اس کلاسیکل حالت تک جا پہنچتی ہے جہاں پہنچ کر اس میں ایک کمال کی بے فکری اور بلا کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر:

جنونِ عشق کو کیوں رہنما کی حاجت ہو
یہ بہتا پانی ہے خود راستہ بنا لے گا

....

نفع کی فکر نہیں اور زیاں کا خوف نہیں
محبتوں کے عجب کاروبار ہوتے ہیں

محبتوں کے تپتے ریگستان میں دکھ کی ریت اڑاتی ان کی محبت سے لبریز غزلوں میں شاعرہ کا اظہار احساس اس قدر کھلا ہوا نظر آتا ہے جیسے سچ مچ اپنے گاؤں آ گیا ہو۔ اس مجموعے سے گزرتے ہوئے تخلیق کار کی چھبی اس بے چین ہرنی کی طرح محسوس ہوتی ہے جو اپنے من میت کی یاد میں غزل در غزل تڑپتی ہوئی بھٹک رہی ہو۔ یہی تو غزل کا روایتی رنگ ہے۔

مجھے امید ہے کہ رومانی غزلیں پسند کرنے والا قاری ٹکسالی زبان، اردو ڈکشن اور مزاج والی ان غزلوں کا تہِ دل سے خیر مقدم کرے گا اور امکانات سے لبریز شاعرہ کی آنے والی تخلیقات کی کامیابی کے لیے انہی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے یہ دعا بھی ضرور مانگے گا:

ایسا فن مجھ کو عطا کر اے خدا / لوگ خوش ہو جائیں میرے کام سے

(پھر کھلے پھول، صادقہ نواب سحرؔ، پری درشیہ پرکاشن، ممبئی، ۲۰۱۸ء، ممبئی)

☆☆☆

آزدی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت اور ڈاکٹر سحر

ڈاکٹر وسیم بیگم
مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد

صادقہ صاحبہ اردو شعر و ادب میں عصری دور کی ایک اچھی شاعرہ اور فکشن نگار بن کر ابھری ہیں۔ یہاں ان کی شاعری کے حوالے سے بات ہوگی۔ انہوں نے غزل اور نظم دونوں پر توجہ کی۔ ان کی غزلیں سادہ، سلیس اور چھوٹی بحروں میں ہیں لیکن ان میں تازگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ نسوانی حسیت تو ان کے یہاں برائے راست ابھر کر سامنے نہیں آئی کیونکہ یہ خود ایک عورت ہیں اس لیے تانیثی حسیت کو کہیں کہیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نسوانی زبان اور لب ولہجہ ان کی شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعرہ نے منفی سوچ سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ ان کی غزل میں مثبت سوچ زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

زندگی غم ہی نہیں ہم کو خوشی بھی دے گی
دونوں رخ ایک ہی ہوں ایسی کوئی تصویر نہیں

....

ہو نہ مایوس اس کی رحمت سے
کیا خبر وہ نواز دے کب کیا

(انگاروں کے پھول، صفحہ نمبر ۴۵ اور صفحہ نمبر ۲۵)

ان دونوں شعروں میں ایک ایسی سوچ کارفرما ہے جو قاری کو مایوسی کے بجائے مسرت کی طرف لے جاتی ہے۔ دور حاضر میں جہاں انسان مختلف پریشانیوں میں گرفتار

ہے، وہیں اسے مثبت سوچ کی ضرورت ہے۔ پہلے شعر میں زندگی کے اس فلسفے کی طرف اشارہ ہے، جہاں انسان کو خوشی اور غم دونوں جذبوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی زندگی میں غم آیا ہے تو اس کو رنج وغم سے نہیں گھبرانا چاہیے بلکہ اس سے گزر کر اس مسرت کا انتظار کرنا چاہیے جس میں خوشی ہی خوشی حاصل ہوگی۔ دوسرے شعر میں خدا کی رحمت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان میں صبر وتحمل بہت کم ہوتا ہے اور جب بھی وہ مشکلات اور مصیبتوں سے گزرتا ہے، مایوس ہو جاتا ہے۔ مایوسی تو ہمارے یہاں کفر ہے، اسی لیے شاعرہ یہاں یہ کہہ رہی ہیں کہ اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔ کسی کو نہیں پتہ کہ وہ کب کس کو کیا نواز دے۔ اس لیے اس رب العالمین کی ذات سے پوری امید رکھنی چاہیے۔

صادقہ صاحبہ نے عورت ہونے کے ناطے نسوانی جذبات واحساسات کا اظہار تو ضرور کیا لیکن کبھی مردوں کی جانب سے ہونے والے ظلم وستم کے خلاف آواز بلند نہیں کی، مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

(انگاروں کے پھول صفحہ نمبر ۱۹)

یہاں کوئی بہت بڑا خیال یا کوئی گہری فکر بیان نہیں کی گئی، بلکہ عورت کی فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا جو ایک قدرتی عمل ہے کہ ہر ذی شعور عورت اپنا گھر بسانا چاہتی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتی ہے، کسی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جاتا ہے اور کسی کا نہیں۔

صادقہ کے یہاں عورت اپنا تشخص اپنی خودداری اور انا کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کے برعکس وہ اپنے شوہر کی خوشی اور رضا چاہتی ہیں اور اس کی رضا میں خود بھی اپنی خوشی تلاش کرتی ہیں۔ ایک مشرقی عورت کی طرح مرد کے حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض اولین سمجھتی ہیں۔

تمہاری رضا میں ہماری رضا ہے
جو تم چاہتے ہو وہ ہم چاہتے ہیں

(انگاروں کے پھول صفحہ نمبر ۵۰)

آپ کا حکم فرض ہے مجھ پر
بولیے مجھ کو حکم ہے اب کیا

(انگاروں کے پھول صفحہ نمبر ۲۵)

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعرہ کا اپنا وجود اور اپنی شخصیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ صرف اپنے شوہر کی خوشی کے لیے جیتی ہے اور اس کے نزدیک دنیا کی تمام مسرتیں شوہر کی خوشی میں ہی پنہاں ہیں۔

شاعرہ کی تمام کوششوں اور قربانیوں کے باوجود کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ازدواجی رشتے استوار نہیں ہو پاتے اور ان میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ ان حالات میں شاعرہ اندر سے ٹوٹ جاتی اور یہ کہنے پر مجبو ہو جاتی ہے۔

جب اختلاف ہے تو بچھڑنا ہی ٹھیک ہے
تو جانتا ہے مجھ کو ریا کار میں نہیں

ڈاکٹر صادقہ اپنی شخصیت کی سچائی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ میں جھوٹی، مکار، ''ریا کار نہیں ہوں''۔ جو کچھ میرے اندر ہے، وہی باہر بھی ہے لیکن تمام کوششوں کے باوجود تمہارے اور میرے درمیاں اختلافات برقرار ہیں اور اب ہمارا الگ ہونا ہی ٹھیک ہے۔ یہاں عورت کے اس روپ کو دکھایا ہے جہاں مجبور ہو کر وہ یہ قدم اٹھانے کو بھی تیار ہوتی ہے۔ آگے چل کر صادقہ کو اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ آخر کیوں پوری زندگی میں نے دوسروں کے خواب سجانے پر لگا دی اور اپنے لیے ایک خواب بھی نہیں دیکھ سکی۔ اپنی شخصیت کو جس شخص کے لیے بے معنی کر دیا آج وہی بے وفا ہو گیا۔

اوروں کے لیے ہم نے کئی خواب سجائے
اک خواب بھی کیوں اپنے لیے بن نہیں پائے

(انگاروں کے پھول صفحہ ٦٧)

شاعرہ کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ جس انسان پر میں نے زندگی بھر محبت نچھاور کی لیکن بدلے میں مجھ کو وہ پیار نہیں مل سکا۔آخرایسا کیوں ہے؟ کہ میری قسمت میں پیار نہیں لکھا۔ عورت جو محبت کی دیوی ہے لیکن بدلے میں اس کو نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں مل سکا۔ یہی آج کی عورت کا المیہ ہے۔

اپنے شعری مجموعے ''انگاروں کے پھول'' میں صادقہ نے کچھ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان میں پہلی نظم کا عنوان ہے ''باقی ہے ایک تو ہی''، یہ نظم اللہ رب العزت کی شان میں ہے۔اس میں انھوں نے خدا کو دونوں جہاں کا مالک اور خالق بتایا ہے اور ہم سب اس کے بندے ہیں، اس کی بندگی کرتے ہیں۔اس کے آگے سر کو جھکاتے ہیں اور اللہ ہی کی ذات ہے جو سدا باقی رہنے والی ہے۔ جو کچھ بھی آج تک ہم کو عطا ہوا ہے، اسی کی رحمت سے ملا ہے ہماری ہر خوشی اسی کی خوشی کے ساتھ ہے۔اس کائنات کی ہر شئے فانی ہو جانے والی ہے، باقی بس اس کی ذات ہے جو قائم رہے گی۔اس کے حکم کو ماننا ہمارے لیے لازم ہے۔

''اے دو جہاں کے مالک /مجھ کو یقین ہے یہ /تو مجھ کو دیکھتا ہے /تو مجھ کو جانتا ہے /میں تیری بندگی میں /سر کو جھکا چکی ہوں /تیرے سوا جہاں میں /میرا نہیں ہے کوئی /اے دو جہاں کے مالک /تجھ سے ہے آس مجھ کو /مختار کل ہے تو ہی /جو کچھ مجھے ملا ہے /تو نے ہی دیا ہے / جو کچھ مجھے ملے گا /تو ہی عطا کرے گا /داتا ہے تو ہی میرا /میں تو ہوں اک بھکارن /اے دو جہاں کے مالک باقی ہے اک تو ہی /ہر شے یہاں ہے فانی /جس میں تری خوشی ہے /میری خوشی وہی ہے /جو حکم تو مجھ دے /تعمیل لازمی ہے /اے دو جہاں کے مالک / مجھ کو یقین ہے یہ''

''ہم روئیں کب'' صادقہ کی ایک اچھی نظم ہے۔اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت دکھ اور درد کی حالت میں بھی وہی سب کچھ کرتی ہے جو مرد پسند کرتا ہے۔ یہاں

تک کہ اس کی پوجا بھی کرتی ہے۔اسی کی مرضی کے مطابق گیت بھی گاتی ہے لیکن یہ مرد اس سے کبھی خوشی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ روٹھا رہتا ہے۔تو یہاں اب وہ سوال کر رہی ہیں کہ ہماری پوری زندگی تیری خوشی اور تجھے راضی کرنے میں ہی نکل گئی اور کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ غم کی حالت میں بھی اے وفا تیرے کاندھے پر سر رکھ کر رو لیتے ہنسنا تو رہا دور اور شاعرہ نے یہاں کیفیت کو پلٹ دیا ہے اور ہنسنے کے بجائے اس کے رونے پر زور دیا ہے۔اس کا سارا وقت مرد کی خوشنودی میں نکل جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اس سے ناراض ہی رہتا ہے اور عورت اس کو منانے اور راضی کرنے میں اپنی زندگی گزار دیتی ہے۔

''سب کو ہنسا کر خوش ہوتے ہیں/ یہ بتلا ہم روئیں کب / سپنے بنتے بنتے/ آنکھیں تھک جاتی ہیں/ بکھری زلفیں، بھیگی آنکھیں/ غم کی مورت بن جاتی ہے/ من ہی من میں تجھ کو پوجا/ لیکن ہم نے کیا پایا /تجھ کو اپنا سب کچھ/ سمجھا/ لیکن ہم نے کیا پایا/ گیت سنایا ہم نے وہی/ تیرے دل کو جو بھایا/ پھر بھی سنا ہے/ تو ہے خفا/ ہائے وفا تیرے کاندھے پر سر رکھ کے/ یہ بتلا ہم روئیں کب''۔

دور حاضر میں انسان کی زندگی میں اداسی، بے چینی، بے قراری کچھ اس طرح گھر کر چکی ہے کہ اس آگ میں ہر انسان کا دل جل رہا ہے۔ایسا اس لیے ہے کہ ہر انسان زندگی کے میدان میں بازی مار لینا چاہتا ہے۔ایک دوسرے کو نیچا دکھانے یا ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی ایک ہوڑ چل پڑی ہے۔اگر کسی نے ایک مکان تیار کر لیا تو میں دو کر کے دکھاؤں، اگر کسی کا بیٹا امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چلا گیا تو میرا بیٹا اس سے بڑے کورس میں جائے گا۔اگر کسی کو اچھی سروس مل گئی تو مجھ کو اس سے بھی زیادہ اچھی سروس ملنی چاہئے۔competition نے انسان کا سکون چھین لیا اور اس کی جگہ اس کے دل میں بے چینی و بے قراری کی ایک آگ بھر گئی۔انسان کی خواہشات کی کوئی انتہا نہیں رہی۔جب ایک خواہش ختم ہوتی ہے تو دوسری پھر تیسری خواہش جنم لے لیتی ہے۔خواہشات کا یہ تلاطم کبھی ختم نہیں ہو پاتا۔انسان ختم ہو جاتا ہے اور اپنے سینے میں یہ آگ بھی لے جاتا ہے۔

یہاں غالب کا یہ شور بے اختیار یاد آ رہا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے میرے ارمان پھر بھی کم نکلے

''پتھروں کا شہر'' میں شاعرہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

''سلگ رہا ہے ہر ایک دل یہ کیسی آگ میں آج / کہیں سکون نہیں ہے کہیں قرار نہیں / یہ کس کا دوش ہے کیوں زندگی اداس سی ہے / دلوں کے شہروں میں رقصاں ہیں خواہشوں / کے ہجوم / غم حیات ہمیں اتنا وقت ہی دیے دے / ہم اپنے آپ نئے حوصلوں کے ساتھ جئیں / کچھ ایسے پل جو میسر ہمیں بھی آ جائیں / دکھائیں راستہ لوگوں کو خضر کی صورت / چراغ بن کے جلیں اور کبھی نہ بجھ پائیں / کہ شہر سنگ میں ہم روشنی تو کر جائیں۔''

(پتھروں کا شہر صفحہ ۷۵، انگاروں کے پھول)

آخری بند میں خدا سے دعا کر رہی ہیں کہ اے خدا تو ہم کو اتنی مہلت تو دے کہ ہم اپنی زندگی نئے حوصلوں اور ولولوں کے ساتھ جئیں۔ ہمیں یہاں کچھ ایسے لمحات بھی میسر آ جائیں کہ ہم خضر علیہ السلام کی طرح بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھائیں۔ ایسا چراغ بن کر ہم جلیں جس کی روشنی کبھی ختم نہ ہو اور جو اندھیرے میں لوگوں کو راستہ دکھائے اور چلتے چلتے اتنا تو کر یہ جائیں گے کہ یہ چہرہ جو مایوسیوں اور اداسیوں کی وجہ سے پتھر ہو چکا ہے، اس میں کچھ روشنی پیدا کر دیں۔

صادقہ صاحبہ کی ایک اور اچھی نظم ''بھیک'' ہے جس میں انھوں نے سماجی حسیت کے ساتھ دور حاضر کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے:

میں کشکول ہاتھوں میں لے کر

اسی رہ گزر پر کھڑی ہوں

کہ جس پر سبھی چور ڈاکو

گزرتے رہے ہیں

تڑپ اپنے دل میں لیے
میں اس رہ گزر پر کھڑی ہوں
جہاں ننھے بچے سسکنے لگے ہیں
یہ جیون کی خاطر ترسنے لگے ہیں
کہ چیخیں فضاؤں میں حل ہوگئی ہیں
مجھے دودھ دے دو مجھے دودھ دے دو
کوئی لاش ہے بے کفن
میں کشکول ہاتھوں میں لے کر
اسی راہ گزر پر کھڑی ہوں
اور اپنے ہی اشکوں سے کشکول کو بھر رہی ہوں

(بھیک صفحہ ۱۸۰ انگاروں کے پھول)

شاعرہ نے سماجی حسیت کے ساتھ یہاں عورت کی نفسیات پر بھی زور دیا ہے، حالانکہ اس کو معلوم ہے کی اس راستے سے چور ڈاکو گزرتے ہیں۔اس کے باوجود وہ اسی راہ پر بھیک کا پیالہ لیے کھڑی ہے۔

نیز جہاں معصوم بچے دودھ کے لیے ترس رہے ہیں اور ان کی درد بھری آہیں اور آوازیں فضامیں گھل گئی ہیں۔

وہاں بھیک مانگ رہی ہے۔کوئی لاش اپنی پہچان کھو بیٹھی ہے تو کوئی بے کفن پڑی ہوئی ہے۔شاعرہ اسی راہ میں کھڑی کشکول ہاتھ میں لیے بھیک کی منتظر ہے۔ابھی تک کسی نے کچھ نہیں ڈالا اور یہ پیالا اسی کے اشکوں سے ہی بھر گیا ہے۔

یہاں شاعرہ نے تین کیفیات کو بیان کیا ہے۔ایک وہ کیفیت جہاں سے چور ڈاکو گزر رہے ہیں تو ان کا کام تو ویسے بھی چوری کرنا اور لوگوں کو لوٹنا ہوتا ہے۔ وہ بھلا اس بھکارن کے کشکول میں کیا ڈال سکیں گے۔ ان کو تو اس کے پیالے میں چند سکے مل

جائیں گے تو وہ ان کو لوٹ لیں گے۔ دوسری کیفیت وہ ہے جہاں بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں اور دودھ کی ایک بوند کو ترس گئے ہیں ان کی آہ و بکا اور سسکیاں سننے والا کوئی نہیں ہے۔ ان حالات میں بھیک بھلا کوئی کیا دے گا۔ تیسری کیفیت وہ ہے جہاں دہشت گردی یا مذہبی فرقہ واریت کی وجہ سے چاورں طرف انسانوں کی لاشیں بچھی ہوئی ہیں۔ کوئی لاش بے کفن ہے تو کوئی اپنی شناخت ہی کھو بیٹھی ہے۔ ایسے میں کوئی کسی کے کشکول میں بھلا کیا ڈال سکتا ہے۔ یہ وہ دگر گوں حالات ہیں جو ہمارے معاشرے میں عام ہو چکے ہیں۔ یہ عصری دور کے ایسے حقائق ہیں جن سے آج ہمارا ملک ہندوستان دوچار ہے۔

شاعرہ نے اپنی ایک نظم ''عوض'' میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ عورت سرتاپا محبت ہوتی ہے اور اسی الفت کو وہ دوسروں پر نچھاور کرنا چاہتی ہے۔ اندر سے یہ عورت بکھری اور ٹوٹی ہوئی ہے لیکن اپنے درد کو چھپا کر اپنے محبوب کے لیے گیت گاتی ہے۔ پھر بھی اس کو اس پیار کے بدلے پیار نہیں ملتا۔ اس لیے وہ اداس ہو کر سوچتی ہے کہ کیا مجھے اس محبت کو تیاگ دینا چاہیے۔ دوسرے ہی لمحے اس کو خیال آتا ہے کہ بھلا میں اس درد کی چھایا میں کیسے زندگی بسر کروں گی اور وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ میں اپنے چاہنے والے کے تمام غم بانٹ لوں گی اور اس کو خوشی کے گیت سناؤں گی۔ اس پیار کے خاطر میں اپنی زندگی داؤں پر لگا لوں گی اور اس شعر پر اپنی اس نظم کو ختم کرتی ہے:

تم نے تو مجھ کو دیے غم بے شمار
میں عوض میں اس کے تم کو دوں پیار

(عوض، صفحہ ۷۶، انگاروں کے پھول)

دراصل یہ نظم اپنے انداز بیاں کے اعتبار سے گیت کا سا رنگ وروپ لیے ہوئے ہیں۔ اس میں اپنی ایک ترنم بھی ہے اور ردم بھی، ساتھ ہی شاعرہ کے یہاں لفظیات کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے کہ اس کے زیادہ تر مصرعوں پر گیت کا گماں ہوتا ہے۔

''کالے سپیرے'' میں صادقہ نے استعاراتی لب ولہجے کو اپنایا ہے۔ ہندوستان جو

ہمارے وطن کی سرزمین ہے، ہماری ماں ہے اور یہاں پر رہنے والے دیش واسی اس کے بیٹے۔ایک ماں اپنے سپیروں سے سوال کررہی ہے کہ آخر مجھ کو ذلیل ورسوا کر کے تم کو کیا ملا؟ میں تو خود زنجیروں میں قید تھی لیکن تم نے انگریزوں کی غلامی سے مجھ کو آزاد کرایا۔مجھ پر بڑا احسان کیا لیکن اچانک اب تم کو کیا ہو گیا؟ تم آپس میں کیوں لڑ رہے ہو؟ تم ایک دوسرے کے خنجر گھونپ کر خوش ہو رہے ہو! تمہاری سوچ، تمہاری ذہنیت دیکھو کہاں پہنچ گئی؟ آہستہ آہستہ تم ایک دوسرے کے گھر بھی جلانے لگے! کبھی بھاشا، کبھی مذہب کے بہانے ایک دوسرے سے لڑتے ہو۔جب میں کسی گورے سپیرے کی غلامی میں تھی تب بھی یہ مذہب یہ بھاشائیں موجود تھیں لیکن تم سب اس وقت گلے مل کر چلتے تھے اور وطن کی آزادی کے لیے تم سب ایک ہو گئے تھے۔اس وقت کوئی مذہب، کوئی بھاشا، کوئی ذات تمہارے درمیان نہیں آئی۔مجھے اس کل پر فخر ہے اور آج پر میں شرمندہ ہوں۔ہمارے دیس میں مندر، مسجد، گرجا گھر کسی کی بھی کمی نہیں ہے۔پھر تم آپس میں کیوں لڑتے جھگڑتے ہو؟ بڑے دکھ کی بات ہے، تم نے اپنے بھائی کو مارا اور اس کے گھر کو جلایا ہے۔جس گھر پر تم پتھر برسا رہے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ پتھر تمہارے گھر میں آ کر گرے، یہ کون دھن بجا رہا ہے؟ جن پر تم ناچتے ہو۔ بس ان کالے سپیروں کا میرے وطن کی دھرتی پر کوئی کام نہیں ہے۔ان کالے سپیروں کو اس سرزمیں سے نکال دینا چاہیے تاکہ پھر ملک میں بھائی بھائی آپس میں نہ ہی لڑیں جھگڑیں اور ہی ایک دوسرے کا خون بہائیں۔ملک میں چاروں طرف امن وامان ہو۔

ہمارے ملک ہندوستان کی آبادی کا ستر فی صد حصہ گاؤں اور دیہاتوں پر منحصر ہے لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ ہمارے کسان آج بھی بھوک سے مر رہے ہیں اور پورے سال محنت کرنے کے بعد بھی ان کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ہر سال یا تو قحط پڑ جاتا ہے یا سیلاب آ جاتا ہے۔کسان بیچارے جو ساہوکاروں سے سود پر قرض لیتے ہیں، وہ سود بھی نہیں اترتا۔اوپر سے کھانے پینے کو روٹی نہیں ہوتی۔نتیجے کے طور پر یہ کسان خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ایسے ہی

کسانوں پر صادقہ نے ایک نظم لکھی ہے: ''کیا کرتے !!(کسانوں کی خودکشی پر)''

''آندھر مہاراشٹر کے کھیتوں میں رصدائیں گونجیں رکچھ دیئے اور بجھے راپنی عزت کو سنبھالے ہوئے ردوجسم کٹے راور جسم جلے رپوچھلو روح سے ان کی رکہ ہوا ایسا کیا؟ کس لیے جان سے پیاروں کی نکالیں جانیں؟ قرض کے بوجھ نے زندوں کو کیا مردہ کیا؟ رپیسوں کی تنگی سے بیٹی بیاہی نہ گئی رزندگی بوجھ ہوئی رجینے کی ہمت بھی گئی ربیچ مجدھار میں پیرا کی طاقت بھی گئی رہے غلط۔ کتنا غلط لڑنے کی ہمت گئی رجا کے منتر الیوں کے در پہ ہی دھرنا دیتے رہا کہ بتلائے کوئی ایسے میں وہ کیا کرتے!

(کیا کرتے! کسانوں کی خودکشی پر، ماہنامہ شاعر، ستمبر، صفحہ ۴۳)

اس نظم میں ہمارے کسانوں کی وہ حقیقت چھپی ہوئی ہے جس سے وہ صدیوں سے جوجھ رہے ہیں۔ ان کا درد کرب روز بروز بڑھ رہا ہے لیکن ان کی تکلیفیں اور پریشانیاں کسی طرح کم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ یہی ہمارے کسانوں کا سچ ہے جو پورے ملک کے لوگوں کے لیے اناج بوتے ہیں۔ اپنے خون پسینے سے اس کو سینچتے ہیں لیکن انھیں کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

''کہ بچپن چھوٹ جائے گا'' میں شاعرہ نے عورت کی اس نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ بچپن کی سہیلی کو یاد کر کے بہت خوش ہوتی ہے لیکن صرف اس سے اس لیے نہیں ملنا چاہتی ہے کہ اب وہ بچپن کی چلبلی سہیلی نہیں رہی بلکہ اپنے بچوں کی ماں، اپنے شوہر کی بیوی اور ایک ذمے دار عورت بن چکی ہے اور اگر آج اس سے ملاقات ہوگی تو وہ بچپن کی باتیں کرے گی، نہ اس کی حرکتیں بچپن کی ہوں گی۔ اس سے ملنے کے بعد بچپن بہت پیچھے چھوٹ جائے گا۔ اس ڈر سے وہ اپنی سہیلی سے نہیں ملتی، نہ اس کو تلاش کرتی ہے۔

''میرے بچپن کی یادوں میں ربسی پیاری سہیلی رمیرا دل چاہتا ہے رتجھ سے ملنے کو رمیں تجھ کو ڈھونڈنا چاہوں رتو بے شک ڈھونڈ سکتی ہوں رمگر میں تجھ کو ڈھونڈوں گی نہیں کیونکہ رتو اب دو چوٹیاں ڈالی ہوئی رمعصوم سی لڑکی نہیں ہوگی رتیرے ہاتھوں میں رسی رجیب میں رنگین

پتھر/آنکھ میں شوخی نہیں ہوگی/بڑی چھوٹی سی باتوں پر/تو مجھ سے کیسے جھگڑے گی/ذرا سا گدگدانے پر/شکایت ٹیچروں سے کر نہ پائے گی۔''

صادقہ نواب سحرؔ دور حاضر کی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ ان کی نظمیں گاہ بہ گاہ مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے چھوٹے چھوٹے حقائق کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناطے ان کے یہاں عورت کے مسائل پر اتنا زور نہیں ملتا لیکن انہوں نے عورت کو محبت کرنے والی اور قربانی دینے والی شئے کے طور ضرور پیش کیا ہے، جو الفت کے بدلے الفت کی تو ضرور آرزومند ہے لیکن اگر اس کو بدلے میں پیار نہیں بھی ملتا، تب بھی وہ اپنے شوہر محبوب کے تمام غم لے کر اس کی جھولی میں صرف محبت ڈالنا چاہتی ہے۔ اپنے دکھ درد کا مداوا نہیں چاہتی بلکہ اپنے محبوب پر اپنی جان بھی نچھاور کر دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی اور معاشرتی مسائل کو تو ضرور پیش کیا گیا ہے لیکن مردوں کے ظلم وستم کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ملتا۔

صادقہ نے اپنی شاعری میں سادہ اور شگفتہ زباں کا استعمال کیا ہے۔ ان کا لب ولہجہ شروع سے آخر تک سبک اور شیریں ہے۔ وہ زندگی کی جنگ محبت سے جیتنا چاہتی ہیں۔ فنی اعتبار سے ان کی شاعری میں درد وکرب کی وہ لہر موجود ہے، جو ان کو زندہ تابندہ رکھے گی۔ بہ حیثیت شاعرہ اور ناول نگار اردو شعر وادب میں یہ اپنی شناخت قائم کر چکی ہیں۔

('آزادی کے بعد اردو شاعری میں تانیثی حسیت'

ڈاکٹر وسیم بیگم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲)

پتھراتے رشتوں کی داستان: پتھروں کا شہر

دامودر کھڑسے

ہمارے آج کے وقت میں پتھراتے رشتوں اور ٹوٹتے سمبندھوں اور تخلیقی سناٹے کے درمیان اگر کوئی شاعری رچ کر اپنے اظہار کی پگڈنڈی بناتا ہے تو واقعی یہ ایک امکانات بھرا واقعہ ہے۔ عالم کاری اور بازارواد کے اس دور میں ہر آدمی سرپٹ بھاگ رہا ہے۔ منزل کسی کو نہیں معلوم کیونکہ سب دوڑ رہے ہیں اور کچھ تماش بین غیر ذمہ دارانہ ڈھنگ سے اس چوہا دوڑ و دیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں آدمی کے احساسات چر چرا رہے ہیں۔ کسی کے پاس ایسے ٹوٹتے احساسات کی کراہ سنائی نہیں دیتی۔ شور بہت ہے، باہر بھی اور اندر بھی۔ ایسے شور کے درمیان اگر کسی کو اپنا پورا شہر ہی پتھراتا لگے تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ایسے پتھروں کے شہر میں اگر کوئی اپنی احساسات کو ملفوظ کرنے میں مگن ہے تو ظاہر ہے شبد گونج اٹھیں گے...ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے جذبات شاعری کا دامن تھام کر 'پتھروں کا شہر' نامی شعری مجموعے میں یکجا ہیں۔

صادقہ نواب سحر کا یہ شعری مجموعہ کئی نظریے سے اہم اور قابلِ ستائش ہے۔ اردو، ہندی، انگریزی زبانوں کی جانکار صادقہ کے قلم سے نکلی یہ نظمیں اردو کی چاشنی پا کر اور readable ہوگئی ہیں، ساتھ ہی انہوں نے خود بھرپور اور مشہور فکشن نگار ہونے کے ناطے نظموں کا تانا بانا کتھا سوتروں کے رنگوں میں ڈھالا ہے اور ایک بات خاص یہ ہے کہ بیان اور معنوں میں ان کی شاعری نہایت سہج اور آسان فہم ہیں۔ کہیں بھی ابہام نہیں ہے۔ قاری کی نظر سے یہ ایک کامیابی ہی ہے۔

صادقہ نواب سحر اپنی نظموں میں بہت رچائی ہیں۔ زندگی کی تمام کجیوں اور چیلنجوں کو وہ بہت باریکی اور نزاکت سے ڈھالتی ہیں۔ ان کا آخری نتیجہ زندگی کی امید، آدرش

اور وفاداری فرد کا آئیڈیل ہے۔ وہ کہتی ہیں:

''سمندر کے سوکھنے/ بند کے ٹوٹنے/ بغیچے کے مرجھانے کا/ کیا اتنا ہی غم ہوتا ہے/ جتنا کہ آدرش کے ٹوٹنے کا''

اسی لئے وہ آگے کہتی ہیں۔

''جب آدرش ٹوٹتے ہیں/ تو اپنی پرچھائیں ہی نہیں/ پورا وجود ہی/ ٹوٹا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔''

آدرشوں کا ٹوٹنا بہت بھیانک ہے۔ زندگی سے آدرشوں کا ہٹنا آتما کا بکھر جانا ہے۔ شاعرہ نے اس بات کو بڑی باریکی سے لفظوں میں باندھا ہے لیکن رکنا تو ہار جانا ہے۔ اسی لیے امید، امنگ اور جوش کا دامن تھام کر آدمی کو آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ وہ فوراً آگے کہتی ہیں:

''ابھی تو میں مری نہیں/ ابھی تو میرے دل میں ہے/ محبتوں کی چاشنی/ عداوتوں کی راگنی/ ہے مجھ میں اب بھی جینے کا/ نیا نیا سا حوصلہ''

آدھی دنیا کی پوری پیروی شاعرہ ضرور کریں گی۔ مرداساس معاشرے میں عورت کی حیثیت پر ہمیشہ سوالیہ نشان لگتے رہے ہیں لیکن جس لگن، سمرپن، پرتی بدتا اور مقابلے میں آگے نکل جانے کا جنون عورتوں نے دکھایا ہے، اس سے ان کے اندر کا صدیوں کا لاوا اب پھوٹنے کو ہے۔ اب اور نہیں دبنا، سہنا، کٹنا... شاعرہ کہتی ہیں:

''یہ عورت آج کی آگے بڑھے گی/ پڑھے گی بھی لڑے گی بھی/ یہ اپنے حق کو سمجھے گی اسے حاصل کرے گی بھی/ وہ جھوٹی شرم جو تم نے سکھائی، تج کے چھوڑے گی/''

احساسوں کی چادر اڑھا کر عورت کو کبھی کبھی چپ کرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ جب ادھیکاروں، دباؤں اور استحصال سے وہ نہیں مانتی نہیں جانتی جھکنا، تب اسے احسانات تلے روند کر باتیں تھوپی جاتی ہیں۔ اس سازش کو شاعرہ دوٹوک لفظوں میں کہتی ہیں:

میرے محسن مرے انداز میں جینے دے مجھے/ ترے احسان بہت ہیں مرے دل پر لیکن/ اپنے احسانوں سے ہٹ کر بھی مجھے جینے دے'' (سنچیتنا)

☆☆☆

صادقہ نواب سحر کی دلت نظمیں

ڈاکٹر محمد شاہد پٹھان، جے پور، راجستھان

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ ایسوسی ایٹ پروفیسر وصدر شعبہ ہندی کے ایم۔سی کالج کھوپولی مہاراشٹر) شاعرہ ناول نگار افسانہ نگار ہیں۔ وہ اردو ہندی اور انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے اور ہندی ادب کی استاد ہیں۔ ہندی کے ساتھ ساتھ وہ اردو میں بھی لکھتی ہیں۔ان کا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' ۲۰۰۸ء میں برصغیر ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ناول اور افسانہ کے ساتھ ہی سحرؔ غزل اور نظم میں طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔ان کا ایک شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے۔سحرؔ ادب اطفال سے بھی دلچسپی لکھتی ہیں۔بچوں کی نظموں پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ منظومات ''جگمگاتے تارے'' زیر اشاعت ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ نے غزلوں اور نظموں میں جہاں اپنے نسائی جذبات واحساسات کا سنجیدہ اظہار کیا ہے، وہیں عصری وسماجی مسائل ومعاملات پر بھی انہوں نے اپنی نگاہیں مرکوز رکھی ہیں۔سحرؔ کے تخلیقی عمل میں درحقیقت ذات سے زیادہ سماج وکائنات کو اہمیت حاصل ہے،انہوں نے خود اپنے شعری وتخلیقی تصور کی بابت لکھا ہے:

> ''ہندی ادب میں فنکاران کے دوطرح کے احساسات مانے جاتے ہیں،سوانوبھوتی (ذاتی تجربہ)، سہانوبھوتی (دوسروں کا تجربہ مثال کے طور پر بھکتی کال کی مشہور شاعرہ اور بھگت میرابائی جو بچپن سے کرشن کی دیوانی ہیں۔''
>
> جب یہ کہتی ہیں۔

ہے ری میں تر پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئی
گھائل کی گتی گھائل جانے اور نہ جانے کوئی

یہ تو ان کا اپنا تجربہ، اپنی قلبی وارداتیں ہیں جو شعر کی شکل میں پھوٹی ہیں بھکتی کال کے اندھے کوی (سورداس) نے ''بھر مرگیت'' میں ان گوپیوں کے احساسات کو اپنے دل پر جھیل کر گوپی بن کر کرشن کے دوار کا جانے پر جدائی کی پیڑا اور درد کو دل پر جھیل کر گیتوں میں سمویا۔ سورداس کے درد کو آپ کسی طرح سے بھی میرا کے درد سے کمتر نہیں مان سکتے۔ انہوں نے سہانو بھوتی (ہمدردی) کو سوانو بھوتی یا اپنے دل کا درد بنالیا تھا۔ کوئی بھی پڑھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر گوپیوں کے پاس ذریعہ اظہار ہوتا تو وہ یوں کہتیں: ''نس دن برست نین ہمارے

''جب میرے طلبا مجھ سے میرے وجدان کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان سے میں یہی کہتی ہوں کہ میں نے احساسات وخیالات پائے ہیں۔ میری شاعری میرا کی کم اور سورداس کی شاعری زیادہ ہے اور یہ مان لینے میں مجھے کوئی جھجک نہیں ہے''

صادقہ نواب سحر نے اپنی بعض نظموں میں بھی اپنے شعری عندیے کی صراحت کی ہے۔ اپنی نظم ''میرا سا نہیں شیبو سا پیالہ'' میں بھی سحر میرا اور شیبو سے وابستہ زہر پینے کے واقعات کی اہمیت ومعنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی فنکارانہ کریم النفسی ودردمندی کا تعلق شیبو کی دلسوزی، ایثار پسندی اور انسانی بھلائی کے جذبے واحساس سے مربوط بتاتی ہیں۔ نظم کے دو بند کچھ اس طرح ہیں:

''زہر تو میں میرا کی طرح پی سکتی ہوں/ مگر اسے پینے میں میری ہتک ہے/ شیبو کی طرح/ پی لوں گی میں زہر زمانے کا/ اور کرشن سی/ سانولی ہو جاؤں گی کوئی بتائے/ میرا کے پیالے سے بہتر میرے دل کا پیالہ ہے کہ نہیں/ زہر تو میرا کی طرح پی سکتی ہوں/ میں شیبو کی طرح پی لوں گی ہر زمانے کا''

سحر کی ایک اور نظم ''گلہ'' میں بھی انسانی ہمدردی، دلسوزی اور انصاف وایثار پسندی کی شعری جھلک نمایاں ہے، نظم کے دو بند اس طرح ہیں:

''جاں نثاری کا جذبہ فنا ہو گیا/ آدمی آدمی سے خفا ہو گیا/ آدمی آدمی سے محبت کرے / ایسے جذبات کا/ قدرداں اب زمانے میں کوئی نہیں/ چن لیا سب نے لالچ کا اب راستہ/ دل کے جذبات سے اب نہیں واسطہ/ درد غیروں کے بھی درد اپنے ہی ہیں/ ان خیالات کا /قدرداں اب زمانے میں کوئی نہیں۔

غرض کہ سحؔر کے شعری اظہارات میں سماجی سطح پر غربت ، پسماندگی اور بدحالی کی زندگی گذارنے والے طبقات کے دکھ درد کا بیان خصوصیت کے ساتھ ہوا ہے۔انہوں نے دوسروں کے آشوب واضطراب کو اپنے غم کا حصہ بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔غریب ومفلوک الحال طبقات پر اہل ثروت اور اہل اقتدار کے ذریعے روا رکھے جانے والے جابرانہ وسفاکانہ رویے کے خلاف سحؔر نے اپنے بیباکانہ خیالات کا اظہار کی ہے۔اس ضمن میں ذیل کے اشعار دیکھے جا سکتے ہیں ؎

ظلم پر روک نہیں امن کی تشہیر نہیں
لوگ جیتے ہیں مگر جینے کی تدبیر نہیں

....

وقت ظالم کے ساتھ ہے صاحب
وقت کو میں نے آزمایا ہے

....

زندگی تو بعد میں ہم کو ملی ہے اے سحؔر
زندگی کے واسطے پہلے ہمیں مرنا پڑا
دکھ ملے سب سے ہمیں، ہم نے سبھی کو سکھ دیا
اس طرح ہم زندگی کا قرض ادا کرتے رہے

....

یاد آتی ہیں مجھے اجڑی ہوئی مانگیں کئی
گلستانوں میں گلیوں کو جب کھلاتی ہے بہار

سحرؔ کو اس تلخ حقیقت کا شدید احساس ہے۔ کہ عصری معاشرہ اس قدر مصلحت اندیش اور خود مرکوز ہے کہ اسے پس ماندہ طبقات کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے تدارک کی یا تو فرصت ہی نہیں یا پھر اسے ظالم کو ظالم، قاتل کو قاتل اور غاصب کو غاصب کہنے کی توفیق نہیں ہے، چناچہ صدیوں سے ظلم واستبداد کا شکار بننے والی اقوام وطبقات آج بھی بعینہ جبر وقہر کا صید زبوں بنے ہوئے ہیں۔ سرکاری سطح پر بھی ان مظلوم ومقہور طبقوں کو کما حقہ تحفظ اور انصاف امداد حاصل نہیں ہے، صادقہ نواب سحرؔ ہمارے ملک ومعاشرے میں صدیوں سے موجود اس طرز ستم وجور سے آگاہ ہیں، چناچہ انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار اور نظموں میں اپنے حقیقت پسندانہ احساسات ومشاہدات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے:

چارہ گری ہی نہیں ملے ہوں گے/اس لیے زخم ان سلے ہوں گے/زندگی نے موت سے بدتر کیا ہم سے سلوک/کیوں سحرؔ تک روز جلتے ہیں سحرؔ ہم شام سے/کوئی جن کا جواب دے نہ سکا/زندگی تجھ سے وہ سوال ملے/آنکھ چپ ہے زبان چپ ہے سحرؔ/غم کے خاموش سلسلے ہوں گے/پتھر صفت ہیں لوگ سبھی اس جہان کے/لوگوں کو دل کے زخم دکھانے سے فائدہ۔

ذات پات اور مذہب وملت کی تقسیم نے ہمارری وطنی سالمیت اور اتحاد کو جو نقصان پہنچایا اور سماجی سطح پر نفاق ونفرت کا جو سلسلہ چلایا ہے، اس کا بھی سحرؔ کو گہرا احساس ہے، لہٰذا وہ کہتی ہیں ؎

بٹے جب سے دھرموں میں ذاتوں میں لوگ
اگلنے لگے زہر باتوں میں لوگ
لمحوں میں انہیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے

بھارت کا روایتی اور کٹر مذہبی معاشرہ دلتوں کے ساتھ ساتھ مسلم معاشرہ سے بھی چھوا چھوت برتا آیا ہے۔ آج بھی گاؤں اور قصبات میں چھوا چھوت کی روایات وبدعات دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس رسم قبیح کا سحرؔ کو احساس ہے، چنانچہ اپنی ایک نظم ''دلت مسلمان'' میں وہ اپنے تجربات واحساسات کا اس طرح اظہار کرتی ہیں:

''میری پڑوسن/ ہر دیوالی پر/ مجھے مٹھائی کھلاتی ہے/ مگر عید پر/ بھیجا ہوا/ میرا شیر خورمہ/ اپنی نوکرانی کو دے دیتی ہے/ جب بھی میرے گھر آتی ہے/ میرے ہاتھوں کی بنی چائے نہیں پیتی/ مگر بازار سے منگوائی کولڈرنک/ سیدھے بوتل سے پیتی ہے/ مجھے احساس ہونے لگتا ہے/ میرا سلسلہ وہ کہاں سے ملاتی ہے/ کیا وہ میری ابتداء میں/ تبدیلی مذہب کے فلسفے کو دیکھتی ہے/ (یا مجھے دلت مسلمان سمجھتی ہے)/تعلیم میں تہذیب میں/ ہر بات میں میں کیا میں گئی گذری ہوں!!!........''

جیسا کہ ذکر کیا گیا سحرؔ کی شاعری میں افلاس وابتلا کے مارے ہوئے افراد وطبقات کا بیان خصوصیت سے ہوا ہے۔ سحر ایسی نظموں میں ''وہ بھی ہنستے ہیں''، ''بچہ مزدوری''، ''سوال'' اور ''بھیک'' وغیرہ قابل ذکر اور لائق مطالعہ ہیں۔ ان منظومات میں شاعرہ نے بہر طور پسماندہ مفلس اور مصائب زدہ طبقات کو درپیش آشوب وادبار کا بیان کیا ہے۔ ہر چند کہ ان نظموں میں بھی دلتوں کی زندگی کا عکس ونقش دیکھا جا سکتا ہے، مگر سحرؔ کی متعدد نظمیں ایسی بھی ہیں جنھیں خود شاعرہ نے ''دلت نظمیں'' سے موسوم کیا ہے۔ ان منظومات میں ''بلاتکار''، ''امبیڈکروادی ادب''، ''اکیسویں صدی کی ایک گھٹنا''، ''دھرم سنکٹ''، ''چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول''، ''رشتہ طے پایا ہے''، ''وندے ماترم''، ''اگلی پیڑھی'' اور ایک درد کا احساس یہ بھی'' وغیرہ شامل ہیں۔

صادقہ نواب سحرؔ نے اپنی دلت نظموں میں جہاں پسماندہ اور صدیوں سے نظر انداز طبقات کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل ومصائب بیان کیے ہیں، وہیں عصری سماج وسیاست کے ذریعے دلتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے جبری وسیاسی طرز وعمل اور اس سے پیدا شدہ مظاہر حیات کو خصوصیت کے ساتھ اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ سحرؔ نے اپنے شعری بیانیے میں طنز آمیز اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ''امیڈکروادی ادب''، ''دھرم سنکٹ''، ''بلاتکار''، ''اگلی پیڑھی''، ''وندے ماترم''، ''دلت مسلمان''، ''اور'' چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول'' نظمیں قابل مطالعہ ہیں۔ ذیل میں بطور مثال چند منظومات پیش ہیں۔ ان مطالعے سے سحرؔ کے طرز احساس اور طریق اظہار پر روشنی ڈالی جا سکے گی۔

۱-اگلی پیڑھی

سنا ر دلتوں کے ایک پورے گاؤں نے/ دھرم پریورتن کرلیا/ پوچھا تو کہا/ ہمیں نہ سہی/ ہماری اگلی پیڑھی کو/ اس کا فائدہ ضرور ہوگا/ کم سے کم وہ تو/ اچھوت اور ر چھوٹی ذات/ نہیں کہلائے گی۔

۲-دھرم سنکٹ

''سنا آپ نے ر دھرم پریورتن کیے ہوئے ر غریبوں کا رشدّی کرن ر کیا جا رہا ہے ر انہیں دوبارہ ر دلت بنایا جا رہا ہے ر کہتے ہیں، سنکٹ کا سمے ہے ر اکیسویں صدی میں جی چاہتا ہے پوچھ ہی لیں ر کیا سچ مچ مذہب خطرے میں ہیں!!!''

۳-بلاتکار

''رزرویشن کے نام پر ر جائز نہ جائز ٹکڑے بانٹ کر ر ووٹ بٹورنے والو! ر یہ بتاؤ ر کیا آج بھی بہو بیٹیاں ر بلاتکار کا شکار ر صرف اس لیے نہیں ہوتیں ر کہ ر وہ اچھوت ہیں!!!''

۴-چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول

''چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ ترے سسرال سے آئی ہے/ یہ بڑھیا بڑی سکھائی ہے/ سنے گی جب یہ تیری ساس/ نا آئے گا اس کو یہ راس/ کریلا نیم میں تو مت گھول/ چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ کبھی تو چمڑا دھوتی ہے/ کبھی تو جوتا گانٹھتی ہے/ کبھی تو گھر کو چلاتی ہے/ کبھی بچوں سے نبھاتی ہے/ تجھے مانے نہ کوئی انمول/ چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ تیرے تن پر آدھے کپڑے/ تو کاہے مول رہی جھگڑے/ جو گھونگھٹ تو الٹائے گی/ نظر کو تو نہ جھکائے گی/ تو کیا سسرال کو بھائے گی!!!/ یہ دنیا کیسی جھولم جھول/ چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول!''

سحؔر کی ایک اہم نظم ''امبیڈکر وادی ادب'' ہے۔ اس میں بھی انہوں نے طنزیہ آہنگ میں کئی زاویوں سے روشنی ڈالتے ہوئے آج کے تعلیم یافتہ طبقہ اور ادباء و ناقدین کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ یہاں مکمل نظم نقل کی جاتی ہے تا کہ 'دلت ادب' کی وجہِ تسمیہ سے لے کر اس کی ادبی

اہمیت، حیثیت اور ماہیت و کیفیت سے متعلق مکمل صراحت اور شکوہ و سوال بروئے کار آسکے۔

''انسان تھا/ پھر شودر ہوا/ اور اچھوت مانا گیا/ پیٹھ پر جھاڑو باندھ کر/ اپنے پیروں کی دھول کو آپ رجھاڑتے ہوئے/ شہر بھر کی گندگی صاف کرتا رہا/ سنا، ابھنگوں کی شاعری میں/ میرے درد کے بادلوں کی/ کچھ بوندیں ٹپکیں/ سنت چوکھا میلا، نام دیو گیا نیشور کا/ درد بھی تو وہی تھا نا!/ صدیوں بعد گاندھی نے مجھے ہریجن کہا/ امبیڈکر نے بودھ بنایا،/ اب پڑھنے پر میرے کانوں میں/ گرم سیسہ نہیں ڈالا جاتا/ لہٰذا میں نے اپنی زندگی نامے کو/ لکھنا سیکھا/ مگر اسے ساہتیہ نہیں/ دلت ساہتیہ کہا گیا/ اب اکیسویں صدی میں/ میری زندگی کی داستان کو/ امبیڈکر وادی ساہتیہ کا نام دینے کی/ کوشش ہو رہی ہے/ جانے میری داستان/ کب انسان کی داستان بنے گی؟/ جانے کب؟؟؟''

(ابھنگ: مراٹھی ادب کی ایک صنف جس میں سنت چکھا میلا، نام دیو، اور گیا نیشور جیسے سنتو نے اپنے درد کی جھلکیاں دکھائی تھیں۔)

سحؔر نے اپنی ایک نظم ''بھیک'' میں دلتوں اور غیر دلتوں پسماندوں کو درد پیش غربت وافلاس کے مسائل کی منظر کشی کی ہے۔ میرے خیال سے ہمارے ملک کے لاکھوں (دلت وغیر دلت) ان مسائل ومصائب سے یکساں طور پر دوچار ہیں، ان مسائل کو سحؔر نے درجہ ذیل نظم میں پیش کیا ہے:

''میں کشکول ہاتھوں میں لے کر راسی رہ گذر پر کھڑی ہوں رکہ جس راہ پر رچور ڈاکو گزرتے رہے ہیں رتڑپ اپنے دل میں لیے رچاند تارے سسکتے رہے ہیں رجہاں پھول کی آہ نے رراہ کو آپ مہکا دیا ریا ننھے سے بچے کی کلکاریاں ر چیخ میں ڈھل گئی ہیں رمجھے دودھ دے دو ر مجھے دودھ دے دو ریہ چیخیں فضاؤں میں رحل ہوگئی ہیں رکوئی لاش کھو بیٹھی پہچان اپنی رکوئی لاش ترسے کفن کو رکوئی زندگی موت کی بھیک مانگے رمیں کشکول ہاتھوں میں لے کر راسی رہ گزر پر کھڑی ہوں رانا کی صلیبوں پہ لٹکی ہوئی رلاش ڈھوتی رہی ہوں راور اپنے ہی آنسوں سے راپنے ہی کشلول کو بھر رہی ہوں''

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر عصری سماج اور دلت کے دیرینہ مسائل سے کما حقہ واقف ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے جہد وعمل اور انقلاب کی مؤید ہیں، چنانچہ بنی نوع انسان سے کچھ اس طرح مخاطب ہیں ۔

زندگی تلخ حقیقت ہے مگر جھیل اسے
زندگی سے تو ملا آج نگاہیں اپنی

....

جو مشکلات سے ہنس کر یہاں نبھالے گا
مجھے یقیں ہے وہ منزل ضرور پالے گا

....

کسی مقام پہ منزل ضرور آئے گی
جنوں کے سائے میں چلتے رہیں گے

....

ہم دونوں کے جذبات اگر سچے ہوں دشوار نہیں کچھ
تعبیر کو پا جائیں گے یہ خواب ہمارے

....

طوفان میں بھی عزم یہ کہتا ہے سحر سے
مل جائیں گے اک روز تجھے اپنے کنارے

فیض احمد فیض نے اپنی معروف نظم ''صبح آزادی'' میں کہا ہے ۔

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صادقہ نواب سحر کو بھی اس حقیقت کا احساس واعتراف ہے کہ ابھی ہمارے ملک کے لاکھوں کروڑوں دلتوں، پسماندوں اور مفلوک الحال افراد کو حصول انصاف وحقوق کے لیے

بڑے ''انقلاب'' کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انقلاب کے لیے اجتماعی جدو جہد، اتحاد اور سنگھرش لازمی ہے، چنانچہ صادقہ نواب سحرؔ کہتی ہیں:

اے سحرؔ آئے انقلاب کئی
آخری انقلاب باقی ہے

سحرؔ نے اپنی ایک اور نظم ''تغیر'' میں ایک ہمدرد اور انسانیت دوست قلم کار کی حیثیت سے جن جذبات واحساسات اور افکار کا اظہار کیا ہے، ان کی اہمیت و معنویت مسلم ہے۔ نظم اس طرح ہے:

''جفا دشمنی اور حسد کے دیئے/ زمانے نے ہر گام روشن کیے/ یہ نفرت کی بھٹی میں جلتے ہوئے/ ملے ہر جگہ راہزن/ ہر اک موڑ پر قاتلوں کی نظر/ یہ دنیا ہے یا کوئی مقتل/ لہو اِس جگہ اتنا ارزاں ہے کیوں/ مری آرزو ہے/ وفا دوستی اور ایثار کے/ میں جلا دوں دیے/ آج سب کے لیے/ میں ہر دل کو خوشیوں کی سوغات دوں/ زمیں خشک ہے اس کو برسات دوں/ اساسِ محبت پہ ہو زندگی/ اندھیرے جہاں کو ملے روشنی/ کسی روز ایسا بھی ہو جائے گا/ کبھی شمع جور و ستم کا بدن/ پگھل جائے گا/ برا وقت آیا ہے ٹل جائے گا/ یقیں ہے مجھے سب بدل جائے گا۔''

من حیث المجموع کہا جاسکتا ہے کہ جینت پرمار، آفتاب کم ذات، ڈاکٹر علی کمیل قزلباش، یعقوب راہیؔ اور ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ ایسے حقیقت پسند تخلیق کار معاصر اردو شاعری میں دلت شعری رجحان کو فروغ دینے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں چندر بھان خیال، ندؔا فاضلی اور بعض دوسرے شعراء کے یہاں بھی ہمارے ملک کے پسماندہ اور نچلے طبقے کی حیاتِ اجتماعیہ کے دلدوز اور جاں سوز پہلوؤں کی نقش گری دیکھنے کو ملتی ہے۔

جگاتے رہتے ہیں راتوں کو اب بھی خواب بہت
کہ صحن صحن میں کھلنے کو ہیں گلاب بہت

(یعقوب راہیؔ)

(تفہیم و تنقید، ڈاکٹر محمد شاہد پٹھان، جے پور، راجستھان، ۲۰۱۲ء)

☆☆☆

صادقہ نواب سحرؔ کی غزل گوئی

آر پی شرما مہرشؔ (ممبئی)

صادقہ نواب سحرؔ کی غزلوں کو پڑھ کر فراق گورکھپوری کا یہ شعر ذہن میں گونجا:

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میرؔ سناؤ بڑی اداس ہے رات

ان کی غزلوں کی شاعرہ کا کہنا ہے ؎

روایت سے سحرؔ رشتہ ہے میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

انھوں نے بقول اُمیش تیا گی 'تیاج' درحقیقت اپنی غزلوں کی مصروی کی ہے اور ایسے شعر کہے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ نیا پن ہے، مثلاً ؎

خلوص پیار کے ایسے حصار ہوتے ہیں نکلنے دیتے نہیں عمر بھر کسی کو سحر
اک نئی زندگی رہی مجھ میں موجِ تشنہ لبی رہی مجھ میں
گلستانوں میں گلوں کے جب کھلاتی ہے بہار یاد آتی ہیں مجھے اجڑی ہوئی مانگیں کئی
لیکن اس کا عذاب باقی ہے لوٹ تو لی گناہ کی لذت

اس طرح صادقہ نے روایتی علاتوں اور لفظوں کو نئے معنی کے پیرہن عطا کرنے کی کوشش کی ہے:

''تخلیقی نظر کا نیا پن، علامتوں استعاروں کو بھی نئے پن سے لبریز کیا جا سکتا ہے۔ اپکرن باسی نہیں ہوتے، باسی نظر ہوتی ہے۔''

صادقہ نواب سحرؔ کی غزلیں ان کی نسوانیت کے نازک جذبات، احساسات اور آرزوؤں ارمانوں سے لبریز ہیں جیسا کہ بطور نمونہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے محسوس ہوتا ہے:

آج زمانہ بدل چکا ہے کیسے جیئے گا کیا جانے
مجھ کو سحر یہ لڑکا بالکل سیدھا سادا لگتا ہے

ان کی غزلوں کی زبان سرل، سرس اور عام فہم ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں کو بھاری بھرکم الفاظ اور فارسی اضافتوں سے بوجھل ہونے نہیں دیا۔ ان میں رفتار، صفائی اور سادگی ہونے کی وجہ سے وہ سلجھی ہوئی اور صاف ستھری ہو پائی ہیں۔ یہ غزلیں اپنے ماحول، اپنی دھرتی اور موضوع کے اعتبار سے گھر پریوار سے جڑی ہیں تبھی تو ان کی نسائی احساسات شاعرانہ انداز میں یوں کہنے کو بے تاب ہونے لگتی ہیں۔

میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

صادقہ نواب کی غزلوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مشہور شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی کہتی ہیں:

''صادقہ کی شاعری میں اپنے وقت کی دوسری شاعرات کی طرح نسائی جذبات اور احساسات کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ اس میں اپنی شاعری پر آزادیٔ نسواں اور اس کے حقوق کی نام نہاد نعروں کا لیبل نہیں لگانے دیا۔ جو آج کی شاعرات کے یہاں ایک فیشن کی طرح چل پڑا ہے۔ صادقہ عورت ہے اور عورت ہی رہنا چاہتی ہے۔ صادقہ حق بات کہنے میں یقین رکھتی ہیں۔

اثر جس میں ہو بات ایسی کریں ہم
لکھے حق جو ایسا قلم چاہتے ہیں

لیکن افسوس یہ ہے کہ۔

حق بولنا تو جرم ہے بازارِ دہر میں
گھر کر گئی ہے یہ بات مرے دل کے شہر میں

انہوں نے یقین جیسے لفظ کو کس قدر نئے استعارے سے نوازا ہے، ملاحظہ ہو:

زندگی میں اتنے دھوکے کھائے ہیں
اب یقیں بھی خواب جیسا ہو گیا

ترقی کے نام نہاد اجالوں پر ان کا طنز دیکھیں ۔

تعمیر کے پردے میں ہے تخریب کا جلوہ
تم کو ہی مبارک یہ ترقی کے اجالے

وہ کس قدر سادگی پسند ہیں، اس کی مثال بھی دیکھیں ۔

جو کچھ ہے دل میں لب پہ وہی آ چکا سحؔر
ہوں سادگی پسند اداکار میں نہیں

کبھی لمحے خطا کرتے ہیں اور کبھی صدیوں کا بنا بنایا کھیل بھی لمحے بگاڑ دیتے ہیں۔اس قرین کا ان کا ایک شعر دیکھئے ۔

لمحوں میں انھیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے

اس کا وہ کارگر علاج بھی ڈھونڈ لیتی ہیں ۔

آؤ رشتوں کی آبرو بن جائیں
ایک دوجے کی جستجو بن جائیں

دیوار کو بھی کان ہوتے ہیں لیکن دیوار شفاف ہو تو کیا ہو!

دیوار نے ہر جرم کو پردے میں رکھا ہے
دیوار کے بھی پار نظر جائے تو کیا ہو

ان کی نسائی اور خودسپردگی کے جذبے دل کو چھو لینے والے ہے ۔

میں اپنی شاعری قدموں میں تیرے رکھ دوں گی
مجھے یقین ہے پلکوں سے تو اٹھا لے گا

سؤ مالی لہروں کا قہر تو ہم نے دیکھ لیا، بے رحم سب کچھ نگل گیا۔ اب ذرا اس قہر کو دیکھئے جو ذرا رحم دل ہے۔

اتنے ہی غم دیے ہیں مجھے، سہہ سکوں جنہیں
کچھ رحم کی ادا بھی ملی تیرے قہر میں

اسی غزل کا یہ شعر بھی دیکھئے۔

تنہائیوں میں یاد مری آئی تو لگا
امرت خوشی کا مل گیا کچھ غم کے زہر میں

امرت کی طرح ہندی لفظ 'اوتار' کو صادقہ نواب سحرؔ نے اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ قافیہ خود 'شاباش' کہنے لگتا ہے۔

یہ کیسے کہہ دوں تجھ سے گنہ گار میں نہیں
اک آدمی ہوں بس کوئی اوتار میں نہیں

صادقہ نے اپنی غزلوں میں بحروں کا استعمال صحیح صحیح کیا ہے۔ یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ غزل غنائی شاعری ہے جس میں بحر اور لے کا نباہ نہایت ضروری ہے۔ مستقبل میں وہ اور بھی خوبصورت غزلیں پیش کریں گی، ایسی ان سے امید ہے۔

☆☆☆

تلخ حقیقت کی غماز ڈاکٹر صادقہ نواب

ڈاکٹر مادھوری چھیڑا
(پروفیسر وصدر شعبۂ ہندی، ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی، ممبئی)

ہندی شاعری کی روایت میں میرا بائی، مہا دیوی اور سبھدرا کماری چوہان جیسے قد آور شاعرات نے اہم حصہ داری نبھائی ہے۔ میرا میں سہج بھکتی اور سمرپن ہے۔ مہادیوی میں بہت گہری حساس کیفیت اور فراق کا درد ہے تو سبھدرا کماری چوہان کی شاعری میں زندگی کی شہنائی! لیکن آزادی کے بعد خواتین قلمکاروں نے اظہار کے لیے فکشن نگاری کو پسند کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستانی سماج میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ٹکراتے ہوئے خواتین نے شاعری کی جگہ افسانہ اور ناول جیسی جدید اصناف کو حقیقت نگاری کے لیے مناسب سمجھا۔ اس کے باوجود معاصرین میں گگن رگل، انامکا، چندرکانتا اور کمل کمار جیسی شاعرات نے اپنی شاعری میں زندگی کی سچائیوں کے کامیاب اظہار کے ذریعے شاعری کے قوتِ اظہار کے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ایسے میں کسی نئی شاعرہ کی آمد مسرت اور تجسس پیدا کرے، یہ فطری بات ہے۔

یہاں شاعرہ صادقہ نواب اپنے اس نئے مجموعے کے ساتھ حاضر ہیں۔ اس نئے شعری مجموعے کے عنوان 'پتھروں کا شہر' سے ہی شاعرہ کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ اپنی نظموں میں اس شاعرہ نے بھی زندگی کی تلخ حقائق کو اپنے اظہار کے مرکز میں رکھا ہے، حالانکہ اس مجموعے میں نسائی احساسات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن میں حسن اور عشق کے ذاتی تجربات بھی شامل ہیں اور سماجی سروکار کی ترجمان ہیں۔ مجموعے کی

نظموں سے گزرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ذاتی تجربوں میں بھی عشق کا مقام بہت پیچھے ہے جو بلند آواز ہے وہ خاندانی اور سماجی سروکاروں کی حرارت سے ہیں۔ معاشرتی شعور میں سماجی نا برابریوں، فرد کے موہ بھنگ (فریبِ نظر) اقدار کی گراوٹ سے اپجے یاسیت وغیرہ کی جگہ خاص ہے۔ تخلیق کار نے بار بار زندگی کی قدروں کا حوالہ دیتے ہوئے آج کے بگڑے حالات کی خستگی کی گہری پڑتال کی ہے۔ ایک فکر گھر آنگن کے پاس پھیلے معاشرے کی محرومیوں کی ہے۔

''ایک میلی سی/ تھکی سی لڑکی/ نیک سی لڑکی/ گھر کا جھاڑو پونچھا کر کے/ ہلدی کے پیلے دھبوں کو/ آنچل بیچ چھپاتی ہے''

ڈاکٹر صادقہ نے ایک قومی اور عالمگیر جنگوں کی تصویر کشی اس طرح کی ہے:

''سرحد پر گولہ باری ہے/ ہتھیاروں کی تیاری ہے/ بھاری توپیں تنی ہوئی ہیں/ وہ دیکھو گولی چلی!''

فرقہ وارانہ تنگ نظری کے تناؤ اور تشدد کی کالی چھایا ہر کسی کو آج ڈرا رہی ہے:

''کس کس کے گھر والوں پر گولی داغی؟/ کس کس کی ماں بہنوں کی عزت لوٹی؟/ کس کس کی بولو تم نے روٹی چھینی؟''

لیکن شاعرہ کی بیدار ذہنی اس منفی موڑ پر ہی ٹھہر نہیں جاتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے احساس کے نکتے پر اپنی تخلیقیت کو ایک سودمند سمت عطا کرتی ہے۔

''یہ ہندو ہے، یہ مسلم ہے، یہ سکھ، یہ عیسائی ہے/ ایک دیش کے باسی ہیں ہم، لڑنا جگت ہنسائی ہے''

اسی سلسلے میں شاعرہ نے عظیم ہستیوں کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے کردار اور اصولوں نے اس ملک کو ایک نئی سمت اور اور نظریہ دے کر خاص پہچان پیش کی ہے۔

''امبیڈکر نے زندگی اپنی گزار دی/ تیرے لیے مرے لیے، ہم سب کے واسطے/... انسان کو انسان کی پہچان دے گیا/ بے جان تھے جو جسم انھیں جان دے گیا۔ کیڑے مکوڑوں

کی طرح جی رہے دلت سماج کو امبیڈکر نے صدیوں کی ذہنی بے ہوشی سے بیدار کیا۔انہیں اپنی خودداری کا احساس دلایا اور ایک نیا چہرہ وردان کیا۔مہاتما گاندھی نے بھی آزادی کے حصول کی حقیقت اور اہنسا جیسے جدوجہد کے نئے اوزاروں سے متعارف کروایا اور عالمگیر بھائی چارے کا سندیش پھیلایا لیکن شاعرہ یہ دیکھ کر غم زدہ ہوتی ہیں کہ ان کے نہ رہنے پر ان کے بتائے سارے راستے بھول کر ہم دوبارہ تشدد پر اتر آئے ہیں۔

''ہندوستانی بندہ تھا سیدھا سادہ بندہ تھا/ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کو ایک سمجھتا تھا/ اب وہ نہیں رہا لیکن یہ نہ کبھی سوچا ہم نے/اس کے گاؤں کے ہی لوگ/ مذہب ٹوٹیں گے/ نام دیکھ کر لوٹیں گے''

شاعرہ کی فکر کے مختلف جزیروں رشتوں اور سمبندھوں کی اہمیت ،رشتوں کے سروکار، قوتِ اظہار ان کی مثبت سوچ کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ماں اور بیٹی دونوں کرداروں نے ان نظموں میں جگہ پائی ہے۔ماں کے نہ رہنے پر یادوں کے روپ میں ماں کی محبت کی یادیں ہیں۔ان کی غیر حاضری سے پیدا ہوا ایک ایسا خالی پن جس کا بھرا جانا ناممکن ہے اور پیچھے جو چھوٹ گیا ہے، وہ سب ماں کی بے جان چیزیں ہیں،بس ان کا استعمال کرنے والی ماں نہیں ہیں۔ماں اگر یہاں یادوں کی شکل میں ہے تو بیٹی کو پانے پر شاعرہ خود ماں کے روپ میں بیٹی پر پیار اور دعاؤں کی بارش برسا رہی ہیں۔یہ نظمیں اس سچ کو اجاگر کرتی ہیں کہ گھر کی دہلیز کے باہر بھی آج کی عورت کامیابی کی بلندیوں کو چھو رہی ہے لیکن اس کا سروکار گھر پریوار سے چھوٹا نہیں ہے،خاندان میں اس کا رول آج بھی اہم ہے اور آج بھی وہ ایک بیدار مغز، اپنے ماحول کو پہچانتی ہوئی اور خاندان کی حدوں سے باہر پھیلے سماج کی activities میں دلچسپی لینے والی معاصر عورت ہے۔موجودہ زمانے کی مناسبت سے وہ اپنی ذہنی اور دانشورانہ بیداری کا ثبوت اس طرح سے دیتی ہیں:

زہر تو میں میرا کی طرح پی سکتی ہوں

میں شیو کی طرح پی لوں گی زہر زمانے کا

یقیناً شاعرہ صادقہ نواب کے تجربوں اور کیفیات کی سطح بے شمار ہیں۔ان کی شاعری میں اپنے ماحول کا سنگھرش اور درد کا اظہار انسانی تجربات کی رنگارنگی، انقلاب کی آرزو اور وہ دل گداز ہیں جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے بے حد معمولی واقعات وحالات سے وابستہ عام آدمی کا دکھ اور جدو جہد کی ترجمان ہیں۔ یہاں قدروں کے ٹوٹنے کی کسک ہے، تکلیف ہے اور قدروں پر مشتمل زندگی کی آرزو وتمنا کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے۔

تخلیقی عمل دراصل بڑی ہی کڑی تپسیا ہے۔ بار بار کے تخلیقی کام تخلیقات کو وقت کے ساتھ ساتھ نکھارتی سنوارتی اور بالیدگی دیتی جاتی ہے، اس لیے شاعرہ کے اگلے مجموعے کا انتظار رہے گا، جہاں زندگی کے تجربات فن کے مکمل ڈھانچے میں ڈھل کر شاعرہ کے ترقی کے گراف کا تعارف دیں گے۔

(پتھروں کا شہر، صادقہ نواب سحر، سحر پرکاشن کھوپولی، مہاراشٹر، ۲۰۰۳ء)

''انگاروں کے پھول اور صادقہ نواب سحرؔ''

ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک

ایسا فن مجھ کو عطا کر خدا
خوش ہو جائیں میرے کام سے

صادقہ نواب سحر کا پہلا مجموعۂ کلام ''انگاروں کے پھول'' ۲۰۰۳ء میں منظر عام آیا تو لوگوں نے اس کی پذیرائی کی لیکن ان کے اندر کا ادیب مطمئن نہیں تھا۔ ان کا مندرجہ بالا شعر ان کی دلی خواہش کا غماز ہے۔ کہتے ہیں تمنا سچی ہو تو ضرور رنگ لاتی ہے۔ دل کا خون کرنا پڑتا ہے۔ جذبوں کی آنچ سے آتش دان دل تپنے لگتا ہے اور منزل کی تلاش جنوں بن کر پیروں سے لپٹ جاتی ہے۔ روح کی ناآسودگی فکر و فن کے نئے آسمانوں کی تلاش میں سر گرداں رہتی ہے۔ آج سحر جس مقام پر ہیں وہ ان کے جذبۂ صادق کی ہی روشنی ہے جو فانوس بن کر محفل ادب میں جلوہ افروز ہے۔

اس روزگار خانہ خراب کی نیرنگیاں بھی عجیب ہیں، یوں ملنے کو تو ہزار ملتے ہیں لیکن غم آشنا اور جاں نثاروں کا فقدان ہے۔ محبت کا جذبہ ایک ایسا زمزمہ ہے جو دل کے تاروں کو ایک بار چھیڑ دیتا ہے تو زندگی بھر اس ساز سے نت نئے سر نکلتے رہتے ہیں۔ صادقہ بڑی معصومیت سے کہتی ہیں:

نہیں ہے شک وفاداری پہ اس کی
ذرا سا آزمانا چاہتی ہوں

روایتیں انھیں بہت عزیز ہیں:

روایت سے سحرؔ رشتہ ہے میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

مٹتی ہوئی قدروں کو دیکھ کر وہ آزردہ ہیں۔ ثقافت اور تہذیب کی بنیادوں کو استوار کرنا انہیں محبوب ہے۔ دل کے مسکرانے کی آرزو ہر انسان میں خوابیدہ ہوتی ہے۔ حالات نے انہیں سنجیدگی کی ردا دی ہے لیکن اب دل شادگام مسکرانے کا تمنائی ہے۔ انہیں زمانے سے گلہ شکوہ نہیں ہے، وہ اپنی کمزوریوں سے آشنا ہیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ یہ ان کی قدآور شخصیت کی آواز ہے۔ کوئی بھی سچا کلاکار کبھی اپنی کلا سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش بیکنار اس کی روح کو آسودگی سے ہمکنار ہونے نہیں دیتی۔ یہ ہی وہ درِّ نایاب ہے جس سے فن اور فکر کے دیپک فروزاں ہوتے ہیں۔ وہ چراغوں سے کیوں الجھے اپنی روشنی سے اس کی روح آشنا ہے۔

بے سبب کیوں لڑوں چراغوں سے
اے سحر روشنی رہی مجھ میں

یہاں اپنے تخلص سحر کا پریوگ بڑا ذومعنی اور پُر مغز ہے۔ سحر تو روشنی کی نوید ہے۔ چراغ تو اندھیروں سے لڑتے ہیں۔ صادقہ کی کچھ غزلوں میں گردوگوں حالات کا شکوہ بھی ہے:

کون سنے گا کس کو سناؤں
وقت کٹھن جو مجھ پر گزرا

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کا کہنا ہے:

"صادقہ کی شاعری میں اپنے عہد کی دیگر شاعرات کی طرح نسوانی جذبات اور احساسات کی عکاسی ضرور ملتی ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ اس نے اپنی شاعری پر آزادیٔ نسواں اور حقوقِ نسواں کے نام نہاد نعروں کا لیبل چسپاں ہونے نہیں دیا جو آج ہر شاعرہ کے ہاں ایک فیشن کے طور پر چل پڑا ہے۔ صادقہ عورت ہیں اور عورت ہی رہنا چاہتی ہیں۔"

دل ناصبور کو وہ سمجھاتی ہیں کہ وہ کسی کو یاد کرنا چھوڑ دے۔ میر نے بھی کہا تھا یاد اس کی اتنی خوب نہیں:

نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

لیکن غالب کا دل کہتا ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا

دانشورانہ مشورے بھی جا بجا اشعار میں گویا ہوئے ہیں:

چین تجھ کو چاہئے تو اے بشر
خواہشوں کے موتیوں کو چھوڑ دے
زندگی میں نذر کر دوں گی اسے
میرے ٹوٹے دل کو کوئی جوڑ دے

گہرا سماجی شعور اور نہ گفتہ حالات کی مار، دھرموں اور ذاتوں میں بٹے ہوئے لوگوں کی زہر پاشی، ہاتھوں میں پھول اور دل میں حسد کے کانٹے، سنبھل کر چلنے کی ہدایت، راستوں پر گھاتوں میں بیٹھے لوگوں سے خبر دار کرنے کی بے لوث کاوش، دنیا کی بری نیت کی طرف اشارہ، شہر میں بڑھتی ہوئی دہشت سے حراساں دل ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کے سادہ لوح دل کو خدا پر اٹوٹ بھروسہ ہے۔

مشکل کیا ہے تیرے لئے
زیست مجھ کو پیاری دے

وہ اتنی ہشیاری چاہتی ہیں کہ نیک و بد کی پہچان کر سکیں۔ نیند میں بھی بیداری کی خواہاں، اتنی خود مختاری کی چاہت کہ نفس بس میں رہے۔ خود آگہی اور عرفان نظر کے خوابیدہ دروازوں کو کھولنے کی متمنی ہیں۔ ان کا ادراک اور خرد دونوں اپنے حالات کے سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ؂

میرے خلاف اگر تو زبان کھولے گا
میری صفائی میں تیرا ضمیر بولے گا

بڑا وثوق ہے شاعرہ کو اپنی الفت کی پاکیزگی پر ؂

میں اپنی شاعری قدموں میں تیرے رکھ دوں گی
مجھے یقین ہے پلکوں سے تو اٹھا لے گا

وہ راہ جنوں کی ہی رہرو ہیں۔ایسی فرزانگی سے وہ اپنا دامن بچانا چاہتی ہیں جو رہ جنوں میں حائل ہو۔

جون عشق کو کیوں رہنما کی حاجت ہو
یہ بہتا پانی ہے خود راستہ بنا لے گا

زندگی بڑی ظالم شے ہے۔زندہ رہنے کے لئے بہروپیا بننا پڑتا ہے ؎

محبت میں متوالہ دل خوشیوں سے لبریز تھا
محبت کیا گئی ساری کائنات گئی

....

تیرے رہنے تک ہی دل میں خوشیوں کا تھا شور بہت
تجھ بن میرے دل کا آنگن سونا سونا لگتا ہے

محبت کا جذبہ ہی ہر شے میں روح رواں ہے۔عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر اسی کے مختلف پڑاؤ ہیں۔محبت تھی خدا کو بندوں سے تبھی تو بھیجا رسول کو، محبت پر ہی دنیا کا وجود قائم ہے۔ چرند ہوں یا پرند، سب میں ہی یہ جذبہ کارفرماں ہے اور انسان کیونکہ اللہ کی سب سے اعلیٰ وارفع مخلوق ہے، اس لئے اس میں اس جذبے کی معراج ہے۔الفت کے انگنت رنگوں اور رشتوں کے اٹوٹ دھاگوں سے اس کا وجود مکلّف ہے۔قرآن اس کا بین ثبوت ہے۔ بڑی تفصیل سے گھر، پریوار، اپنے ہوں یا غیر سب کے ساتھ انسانیت نواز سلوک کا سندیشہ خدا کی انصاف پسندی کی نشانی ہے۔حادثوں سے نبرد آزما ہونا ان کا شیوا ہے۔ انا اور خوداری انہیں ہمیشہ سربلند رکھتی ہے۔انہیں اس بات کا احساس بھی ہے کہ جفا کار نے جفا کے ساتھ کچھ رحم کی ادا بھی ملادی ہے۔ بڑا عمدہ شعر ہے ؎

دل پر غموں کی اوس ہے لب پر خوشی کی دھوپ
کچھ سرد و گرم لہریں ہیں جنوں کی نہر میں

کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے کہ'

''پہلی بات تو ہے زبان کی سلاست پورا مجموعہ پڑھ جایئے، اضافت نام کی کوئی چیز شاذ ہی ملے گی۔ رواں دواں لفظ ایسے کہ زبان سے پھسلے جا رہے ہیں جیسے ؎

غم شناسا نہ جاں نثار ملے
یوں ملنے کو تو یاں ہزار ملے

آگے وہ رقم طراز ہیں:

''دوسری بات یہ کہ بیشتر غزلوں کے لئے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے اور یہ دونوں باتیں ایک عورت کو ہر طرح زیب دیتی ہیں۔ کہیں کہیں غزل کا معیار خاصہ بلند ہو گیا ہے۔ اگر چہ زبان وہی سلیس رہی ہے اور کہنے کا ڈھنگ وہی میٹھا ہے۔''

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ شستہ بیانی، سلاست و روانی ان کی ہر تحریر کا جز لاینفک ہے، جیسے موتیوں کی لڑی ٹوٹ کر بکھر رہی ہے ؎

کیا ہے پیار کا اظہار آپ سے ہم نے
جو پیار کرتے ہیں ان سے خفا نہیں ہوتے

صادقہ کی صداقت اپنی غلطی کا عتراف بھی کشادہ ذہنی کے ساتھ کرتی ہے ؎

یہ کیسے کہہ دوں تجھ سے گنہگار میں نہیں
اک آدمی ہوں بس کوئی اوتار نہیں
جتنا برا سلوک کیا تو نے میرے ساتھ
اتنے برے سلوک کی حقدار میں نہیں
یہ اور بات ہے کہ سزا تو نے دی مجھے
لیکن تجھے یقین ہے خطاوار میں نہیں

ریاکاری سے انہیں چڑ ہے۔ سادگی پسند ہونے کے ناطے وہ اداکاری سے گریز کرتی

ہیں۔وقت کی ستم ظریفی کہ صدیوں میں رشتوں کے جو محل بنتے ہیں لمحوں کی سازش انہیں گرا دیتی ہے۔وہ وفا، دوستی اور قربانی کے چراغ روشن کر کے وہ ہر دل کو مسرتوں سے ہمکنار کرنا چاہتی ہیں۔میرا خیال ہے کہ ان کی نظمیں زیادہ جاندار ہیں۔'تغیر'، 'میرا سا نہیں شیو سا پیالہ'، 'کالے سپیرے'، 'بیزار سہی بیمار نہیں'، 'گلہ' اور 'اولاد' میں موجودہ حالات کی ستم ظریفیوں کو قلم بند کیا گیا ہے ۔

چراغ بن کے جلیں اور کبھی نہ بجھ پائیں
کہ شہر سنگ میں ہم روشنی سی کر جائیں

وہ میرا کی طرح زہر پینا نہیں چاہتیں۔اس میں ان کی سبکی ہے۔وہ شیو کی طرح سارے زمانے کا زہر پینا چاہتی ہیں۔رام و رحیم کی لڑائی انہیں شرمسار کرتی ہے۔بھائی کو بھائی کے گھر میں آگ لگاتے دکھ انہیں ہوتا ہے۔آج کے ماحول سے وہ بیزار ہیں۔

جاں نثاری کا جذبہ فنا ہو گیا ہے۔آدمی آدمی سے خفا ہو گیا ہے۔سب نے لالچ کا راستہ چن لیا ہے۔شاعرہ سب کے ہونٹوں پر چاہت کے نغمے بکھیرنا چاہتی ہیں۔آج اولاد کی بے رخی نا قابل برداشت ہے۔

جب یہ ننھے جواں ہوتے ہیں
فرض کو اپنے بھول جاتے ہیں
ایسے ہوتے ہیں دور یہ جیسے
پنچھی ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں

اپنے اردگرد بکھرے بہت سے مسائل کو انہوں نے اپنی تحریروں میں اتارا ہے۔ بھاشا کی روانی دیدنی ہے۔سیدھے سادے الفاظ میں اظہارِ خیال معتبر ہے۔کتاب کا عنوان ہی اس بات کا مظہر ہے کہ وہ انگاروں میں پھول کھلانے کی تمنائی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں جگی تمنا رنگ آشنا ہو چکی ہے۔

☆☆☆

صادقہ نواب سحؔر اردو ادب میں تانیثیت کے حوالے سے

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں)

صادقہ نواب سحؔر کا اصلی نام صادقہ آراء اسلم نواب ہے۔ محمد اسلم نواب ان کے شوہر ہیں، اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ اسلم نواب لکھنا نہیں بھولتیں۔ ۸ اپریل ۱۹۵۷ء بمقام گنٹور (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے والد کا نام خواجہ میاں صاحب (مرحوم) اور والدہ کا نام شرف النساء بیگم (مرحومہ) تھا۔ صادقہ نواب سحؔر نے اردو، ہندی اور انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی ایچ۔ ای جیسی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ اس وقت وہ بحیثیت صدر شعبۂ ہندی کے۔ ایم۔ سی کالج کھوپولی، ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر) میں اپنے تدریسی فرائض انجام دے رہی ہیں۔

صادقہ نواب سحؔر بیک وقت ہندی اور اردو میں لکھتی ہیں۔ ان کی حیثیت اردو ادب میں ایک شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مضمون نگار اور بچوں کی شاعرہ کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ ''پھول سے پیارے جگنو'' (بچوں کی نظمیں) ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ''پتھروں کا شہر'' (ہندی میں نظموں کا مجموعہ)، ''پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' (ترجمہ وادارت، مجروح سلطان پوری)، ایک ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' اور ڈراموں کے مجموعے ''میرج بیورو'' اور ''سنگریزے''، ایک غزلوں کا مجموعہ ''دریا کوئی سویا سا'' اور ''چھوٹی سی یہ دھرتی'' (مجموعۂ نظم) قابل ذکر تصانیف ہیں۔

ان تمام تصنیف کی قدر و منزلت کے پیش نظر افتخار امام صدیقی (مدیر ماہنامہ 'شاعر' ممبئی) نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''صادقہ نواب نے بھی خود کو ہمہ وقت تخلیقی سمندر بنائے رکھا ہے۔''

جہاں تک صادقہ نواب کی شاعری میں تانیثی فکر احساس اور جذبات و تجربات کا تعلق ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعری میں اپنے دور کی دیگر شاعرات کی طرح تانیثی جذبات و احساسات کی عکاسی ضرور ملتی ہے مگر یہ بات پر مسرت ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری پر ''آزادیٔ نسواں'' اور ''حقوق نسواں'' کے نام نہاد نعروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی بلکہ وہ ایک عورت کی حیثیت سے عورت ہی رہنا چاہتی ہیں۔ صادقہ نواب سحرؔ ایک فرمانبردار بیوی، پاک دامن عورت اور محبت کے جذبے سے سرشار خاتون کی حیثیت سے مرد کی برتری سے انکار نہیں کرتی ہیں۔ وہ اپنے رفیقِ حیات کے سارے درد و غم اپنے دامن میں سمیٹ لینے کو تیار ہیں۔ ان کے کلام میں نسوانی جذبات کی صداقت اور خلوص بیکراں کی قوس قزح کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس صادقہ نواب سحرؔ کو ایک پاک دامن شاعرہ قرار دیتے ہوئے ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''سچ پوچھیے تو میں نے پہلی بار اردو کی ایسی پاک دامن شاعرہ کا کلام پڑھا جس میں شوہر اور شریعت کی پابندی اور روفاداری کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔

ساری دنیا میں عورت آزادی اور مرد کے مساوی حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہ رویہ بھی ایک طرح کی بغاوت ہے ہر چند کہ یہ بغاوت عورت کو مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف اور آزادی کے بجائے تابعداری اور غلامی کی طرف لے جاتی ہے، تاہم اس نوع کی بغاوت اور آزادی کا حق بھی آپ کو حاصل ہے''۔

بلاشبہ صادقہ نواب سحرؔ کا کلام نسوانی جذبات واحساسات اور خلوص و سچائی کا ایک دلرُبا نغمہ ہے جس میں ایک جہانِ نو کی تعمیر و تلاش کی جستجو بھی ہے اور ایک ایسے غمگسار کا انتظار بھی جو ہر قدم پہ ساتھ نبھائے۔ دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے اور حقیقی محبت کا شناسا ہو۔ چنانچہ صادقہ نواب سحرؔ کی کئی غزلیں ایسی ہیں جن میں وہ اپنے محبوب کو آزمانا چاہتی ہیں۔

مثلاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کوئی ہمدرد، غمگسار ملے
زندگی بخش دے وہ یار ملے
غم کے شناسانہ جاں نثار ملے
یوں تو ملنے کو یاں ہزار ملے

....

تعلق کا بہانہ چاہتی ہوں
اسے اپنا بنانا چاہتی ہوں
نہیں ہے شک وفاداری پہ اس کی
ذرا سا آزمانا چاہتی ہوں

....

میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں
روایت سے سحؔر رشتہ ہے میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

ان اشعار کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ صادقہ نواب سحؔر ایک ایسی خاتون ہیں جو روایتی قدروں کی پاسدار ہے۔

وہ دنیا میں عورت کو عورت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہے اور اپنے معیار زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ عورت کی غیر مناسب آزادی کے خلاف ہیں۔ عورت ترقی کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لے مگر فطرتاً وہ عورت ہی رہتی ہے۔

صادقہ نواب سحؔر کے بہت سے اشعار اور غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں یاس وحسرت اور درد وغم کی کسک موجود ہے۔ وہ اپنے محبوب کی خاطر اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد بھی محبوب کی نظروں میں ایک پرائی شے کی مانند اپنے آپ کو تصور کرتی ہیں۔

جستجو کی ہے بہت ہاتھ نہ آیا کچھ بھی
دل دیا جان بھی دی پھر بھی نہ پایا کچھ بھی
میں نے دل کھول کے رکھا ہے تمہارے آگے
تم نے لیکن مجھے اب تک نہ بتایا کچھ بھی

....

آج تک اک بے وفا سے کیوں وفا کرتے رہے
آج سوچا تو یہ سمجھا ہم خطا کرتے رہے
دکھ ملے سب سے ہمیں ہم نے سبھی کو سکھ دیا
اس طرح ہم زندگی کا قرض ادا کرتے رہے

لیکن اس کے باوجود اپنے دلبر کی خاطر اپنی جان نثار کرنے کا جذبہ بار بار عود کر آتا ہے۔اس کے ارمانوں اور خوشیوں کا خیال اس قدر شدید ہے کہ سب تکلیفیں خود برداشت کرنے کو تیار رہتی ہیں۔وارفتگی کا یہ انوکھا انداز بڑا ہی متاثر کن ہے اور ایک عام عورت کے لیے قابل نصیحت بھی ،صادقہ نواب سحر اپنے محبوب سے اس طرح مخاطب ہیں:

سنگ ترے جب چلتی ہوں تو سب کچھ اچھا لگتا ہے
اتنا بتا دے مجھ کو دلبر تجھ کو کیسا لگتا ہے
تیرے رہنے تک ہی دل میں خوشیوں کا تھا شور بہت
تجھ بن میرے دل کا آنگن سونا سونا لگتا ہے

صادقہ نواب سحر کے شعروں کی خوبصورتی اس بات میں ہے کہ ان کے یہاں نسوانیت عورت ذات تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ نسائی زاویہ فکر اور طرز اظہار واحساس متعدد سطحوں پر پھیلتا ہے۔سحر کے یہاں اپنا پن اور اپنا سا دیانتدرانہ رویہ ہے جو موجودہ خواتین شعراء سے جداگانہ ہے۔وہ شاعری کو اپنے جذبات وتصورات کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھتی ہیں۔وہ اپنے مچلتے ارمانوں ،خوابوں اور امنگوں سے آگاہ کرنا اپنا فرض منصبی خیال کرتی ہیں۔ان کے کلام سے یہ لگتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کی پجارن ہیں اور اپنی شاعری کے

ذریعے اس کی محبت کا راگ الاپنا چاہتی ہیں تاکہ دل میں تھوڑا سکون ملے اور درد محبت میں ذرا سا افاقہ ہو۔ نواب سحر کی ایک نظم ''عوض'' ملاحظہ کیجیے تو اس امر کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ وہ پیار و محبت کے طلاطم میں کیا کچھ کہہ رہی ہیں:

بس میری یہ ہی تمنّا / اپنے دل میں / شاعری کا دکھ درد رکھ کر / میں پجارن گیت گاؤں / اپنے ہونٹوں پر سجا کر تیرے گیت / اپنے اشکوں کی زبانی گنگناؤں / ہاں ، مگر ہونٹوں پہ میرے / ہے اداسی / میں ہوں پیاسی / کیا محبت کو میں تج دوں / تیاگ دوں اس پیار کو / مجھ سے یہ ممکن نہیں / درد کی چھایا میں پل کر / میں کہاں جیون بتاؤں / میں تو گاؤں گی خوشی کے گیت / نغمے پیار کے / غم تمہارے بانٹ لوں گی / پیار کے بدلے میں تم کو پیار دوں گی / پیار پر میں زندگی کو وار دوں گی / غم تمہارے بانٹ لوں گی / زخم پر رکھ دوں گی پھاہے / تم نے مجھ کو دیے غم بے شمار / میں عوض میں اس کے کو دوں گی پیار!

اس نظم کے حوالے سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سحرؔ کی شاعری میں نسوانیت کی بو باس موجود ہے۔ وہ بڑے درد انگیز جذبات کا اظہار ایسے لطیف پیرائے میں کرتی ہیں کہ قاری ایک خاص تاثر حاصل کرتا ہے۔ شعری زبان کا ایک خوبصورت استعمال اور مناسب لفظوں کے انتخاب نے ان کے کلام کو شیرینی و شگفتگی میں بدل دیا ہے۔ فکر و خیال کی بلندی اور ایک مشرقی خاتون کی سوچ و فکر اس کی وفا شعاری اور شریک سفر کی تابعداری، یہ سبھی باتیں صادقہ نواب سحرؔ کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں وہ اپنے تخیل کو بڑی فنکاری سے بیان کر لیتی ہیں۔ شاعری صرف ردیف و قافیہ بندی کا نام نہیں بلکہ یہ موزوں طبیعت اور پورے شعری لوازمات کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو صادقہ نواب سحرؔ ایک کامیاب شاعرہ ہیں کیونکہ وہ نہ صرف شاعری کے لیے موزوں طبیعت رکھتی ہیں بلکہ اس کے لوازمات کو بھی بخوبی پورا کرتی نظر آتی ہیں۔

('صادقہ نواب سحرؔ اردو ادب میں تانیثیت کے حوالے سے'
: ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء)

☆☆☆

صادقہ نواب سحرؔ کی نظم گوئی

ڈاکٹر نغمہ جاوید
(ایس این ڈی ٹی یونیورسٹی، شعبۂ ہندی، ممبئی)

ڈاکٹر صادقہ نواب ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ اردو کی نسوانی شاعری میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن ہندی دنیا میں بھی اپنی محنت لگن و کاوش سے وہ اپنی منفرد پہچان بنا چکی ہے۔ ان کا تازہ ترین مجموعہ کلام ''پتھروں کا شہر'' اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

''پتھروں کا شہر'' زندگی کی تلخ حقیقتوں کا عصری تبدیلیوں کا، ناپید ہوتی انسانیت کا، ٹوٹتی بکھری قدروں کا، جبر واستحصال کے مکروہ چہرے کا، فرقہ پرستی سے لہولہان روحوں کے درد کا آئینہ دار ہے لیکن اتنا ہی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر اس میں امیدوں کے چراغوں کی وہ روشنی بھی ہے جو اندھیرے سے متواتر نبرد آزما ہے۔

شاعرہ اخوت والفت کے نغموں سے ساری انسانیت کو سیراب کرنا چاہتی ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر سخت آزردہ ہیں کہ وراثت میں جن انسانی قدروں کو پایا تھا، وہ موجودہ تہذیب کے پاؤں تلے کچل رہی ہیں اور پامال ہو رہی ہیں۔

''میری آرزو ہے/ وفا، دوستی اور ایثار کے میں جلادوں دیئے/ آج سب کے لیے/ میں ہر دل کو خوشیوں کی سوغات دوں/ زمیں خشک ہے اس کو برسات دوں/ اساس مسرت پہ ہو زندگی/ اندھیرے جہاں، کو ملے روشنی''

سحرؔ بے حد سلجھے ہوئے مذاق، منفرد سوچ اور دردمند دل کی مالک ہیں۔ اپنے خون جگر کی آمیزش سے وہ شاعری میں رنگ بھرتی ہیں۔ اس لئے وہ ہمیں جھنجھوڑتی ہیں، رلاتی ہیں،

ہنساتی ہیں، کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ان کے مجموعہ کلام کی پہلی کویتا ''ٹوٹتے آدرش''
میں ایک روحانی کرب کو صاف صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ کرب آج کی زندگی کی
سوغات ہےان دلوں کے لیے جوحساس ہیں۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر مادھوری چھیڑا نے شاعرہ کے ملے جلے جذبوں کی
مہک اور دھنک رنگ احساس احساسات کی بڑی صحیح پرکھ کی ہے:

> ''یقیناً شاعرہ صادقہ نواب کے احساس کی زمین گہری وہمہ گیر ہے۔ان کی
> کویتاؤں میں ماحول کی کشمکش اور کرب کا اظہار، انسانی جذبات کا تنوع، تبدل
> وتغیر کی جستجو اور وہ اثرانگیز کیفیات ہیں جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے بے حد
> معمولی واقعات وحالات سے وابستہ عام آدمی کے دکھ اور جدوجہد کی ترجمان
> ہیں۔ یہاں قدروں کے ٹوٹنے کی کسک تکلیف دہ ہے اور قدروں پر مشتمل
> زندگی کی آرزو تمنا کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے''

صادقہ نواب کے یہاں جینے کا بھرپور حوصلہ ہے۔ان کا دل امنگوں کی کہکشاں سے
روشن ہے۔محبت کی چاشنی سے لبریز ہے۔ جذبوں کے طوفانوں سے تلاطم خیز ہے۔ان کی
آنکھیں آسمان سے روشنی لے رہی ہیں اور اوشا سے حرارت۔ شاعرہ کا فلسفہ حیات ہے۔

''رنگ اور روشنی/ زندگی ۔ زندگی/ خوبصورت نظاروں کی یلغار ہو/ پیار تم کو کرے گی
تبھی زندگی/تم کو بھی زندگی سے بہت پیار ہو''

عورت ہونے کے سبب سحر گھر گرہستی، رشتوں ناطوں کو اہم مانتی ہیں اور ناگریز جانتی
ہیں۔ان رشتوں کی اصلیت سے وہ بھی بخوبی واقف ہیں۔ مائیکہ کسے پیارا نہیں ہوتا؟ مائیکے
کی رنگین یادیں تاعمر انہیں تڑپاتی ہیں

''اور میرا مائیکہ/ وہ پرسکوں جہاں تھا بادلوں سے پرے/ جہاں میں پری سی اڑتی تھی/
بے وجہ کھلکھلاتی تھی/ ماں کی لوریوں کی صدائیں سنتی تھی/ ایک ان دیکھی انجانی/ چاردیواری
میں محفوظ تھی۔''

مائیکے کی آزاد فضا چھوڑ کر لڑکی جب سسرال میں قدم رکھتی ہے تو بہت سی ان دیکھی زنجیریں اس کے پیروں میں پڑ جاتی ہیں۔ اسے بہت کچھ بھلانا ہوتا ہے۔ اسے نئے رشتے استوار کرنے ہوتے ہیں۔ شاعرہ سسرالی رشتوں کو مقدم جانتی ہیں چونکہ ان رشتوں نے ہی انہیں زندگی کا اصلی چہرہ دکھایا ہے، قرب کی صحیح لذت سے ہمکنار کیا ہے۔ جینے کا شعور دیا ہے۔ اونچ نیچ، پیچ وخم سے آشنا کیا ہے۔ ان رشتوں سے وہ دامن چھڑانا نہیں چاہتیں۔

''یہ سسرالی رشتے/ قطرہ قطرہ زہر جما کر رکھتے رہتے ہیں/ اور پھر سرنج کی طرح/ سانپ کے ڈنک سا/ ایک لمحے میں سارا زہر/ میرے شریر میں انڈیل دیتے ہیں/ پھر بھی مجھے ان سے پیار ہے/ یہ میرے وجدان، میری پریرنا ہیں/ انہوں نے ہی مجھے زندگی کا / مطلب سکھایا۔''

صادقہ نواب کے یہاں بے حد نجی احساسات و کیفیات کا ترشح بھی ہے اور فکر وآگہی کا سمندر بھی ٹھاٹھیں مارتا ہے۔

موجودہ زندگی کا کھوکھلا پن، ظاہر داری و دکھاوا، وطنیت کی مقدس قدروں کا فقدان، ثقافتی قدروں کی پامالی کے المیہ کو انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آج کا انسان پتھر کی طرح بے حس ہو گیا ہے۔ پتھر کے پاس دل کہاں ہوتا ہے؟ خود غرضی، مکر وفریب، حسد ودشمنی، ظلم وستم کا بازار گرم ہے چہار طرف۔

''جفا، دشمنی اور حسد کے دیئے/ زمانے نے ہر گام روشن کئے/ یہ نفرت کی بھٹی میں جلتے ہوئے من/ ملے ہر جگہ رہزن/ ہر موڑ پر قاتلوں کی حکومت/ یہ دنیا ہے یا کوئی مقتل/ لہو اس جگہ اتنا ارزاں ہے کا ہے۔''

شاعرہ کا پور پور الفت ومحبت وانس میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ وفا دوستی اور ایثار کے دیے جلانا چاہتی ہے۔

''میری آرزو ہے/ وفا دوستی اور ایثار کے میں جلا دوں دیے/ آج سب کے لیے/ میں ہر دل کو خوشیوں کی سوغات دوں/ زمیں خشک ہے اس کو برسات دوں۔''

غریبی، بدحالی، خستہ حالی اور مفلسی کے ستائے لوگ کیا انسان نہیں ہوتے؟ زمین ان کے لیے تنگ کیوں ہوتی ہے؟ آسمان بے رحم کیوں ہوتا ہے؟ غربت کے ماروں کے پاس کیا دل نہیں ہوتا؟ شاعرہ کڑھتی ہیں آج کی زندگی کا دستور دیکھ کر۔

جس کے ہونٹوں پہ اداسی کی کہانی دیکھی
جس کے چہرے پہ مصیبت کی نشانی دیکھی
اس زمانے میں کوئی اس کا طرف دار نہیں
کیا غریبوں کو محبت کا ادھیکار نہیں

ہندی کے مشہور نقاد ڈاکٹر شیو کمار مشر کا کہنا ہے کہ:

''ڈاکٹر صادقہ نواب کی نظموں و کویتاؤں کا مجموعہ ''پتھروں کا شہر'' جن تمام نکتوں پر ہمارا دھیان کھینچتا ہے، ان میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے پتھروں کے اس شہر کے باشندوں سے اپنے جذباتوں میں ساجھے داری چاہی ہے۔

جس کے مترادف ہماری آج کی دنیا اور آج کا سماج بنتا جا رہا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم آج ایک ایسی دنیا، ایک ایسے سماج اور ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جو نہ صرف انسانی جذبوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے بلکہ آدمی کی آدمیت کے لیے بھی بہت بڑا چیلنج ہے۔''

سحؔر نے اپنے بچوں اور بھتیجی پر بھی بڑی ہی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ سادگی و پرکاری کا بڑا حسین امتزاج ہے ان میں۔

گہنے نئے سجا کر / دولہے کے سنگ جا کر
خوشیوں میں جھول جانا / ہم کو نہ بھول جانا

صادقہ نواب بڑی خاموشی اور لگن کے ساتھ فکر و فن کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ انہیں نہ ستائش کی تمنا ہے، نہ صلے کی پرواہ۔

وہ تو صرف اپنے بے پناہ ذوق اور ذہن کی آبیاری کی خاطر لکھنے میں مشغول ہیں۔ان کی شاعری میں فکر واحساس کی ندرت وتازگی ہے۔ان کے یہاں قدیم روایات کا احترام بھی ہے اور جدیدیت سے انحراف بھی نہیں۔احساسات کی شدت اور نظر کی وسعت نے سحؔر کی شاعری کو سوز بخشا ہے اور اسے موجودہ زندگی کا آئینہ بنادیا ہے۔ ہندوستانی عورت کا دل، اس کے احساسات، اس کے جذبوں کی خوشبو، اس کی تمنا کا ہر رنگ، مشاہدات کی گیرائی وگہرائی اور تجربات کی سچائی وزندگی کے حقائق اپنے گونا گوں رنگوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

''پتھروں کا شہر'' کے کینوس پر.... ذہانت وذکاوت اور جذباتیت کا بڑا حسین سنگم ہے ان کی شاعری میں۔یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی دور تک اور دیر تک ہمارے ذہن ودل میں گونجتی رہتی ہے۔شاعرہ کو گلہ ہے کہ ؂

''چاند کا پھول کا، چاندنی رات کا/ پیار کی بات کا/ قدرداں اب زمانے میں کوئی نہیں''

آج تو یہ حالت ہے کہ جاں نثاری کا جذبہ ہی فنا ہوگیا ہے۔سب نے لالچ کا راستہ چن لیا ہے۔آدمی آدمی سے خفا ہوگیا ہے۔

سحؔر جس کرب سے گزرتی ہیں، اسے قلم بند کرتی ہیں۔اولاد اور ماں باپ کے درمیان آج جو دوری آگئی ہے، اسے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ بچوں کی خاطر والدین اپنی پوری زندگی داؤ پر لگادیتے ہیں اور یہ بچے جوان ہوتے ہیں تو حرف غلط کی طرح انہیں محسوس کرتے ہیں اپنی زندگی کے بیچ۔

جب یہ ننھے جوان ہوتے ہیں/ فرض کو اپنے بھول جاتے ہیں/ ایسے ہوتے ہیں دور یہ جیسے/ پنچھی ہاتھوں سے چھوٹ جاتے ہیں/ خواب لمحوں میں ٹوٹ جاتے ہیں

''گورو پورنیما'' میں استاد اور شاگرد کے بیچ بدلتے رشتوں پر نظر کی ہے۔''ڈھلتی شام'' میں قدرتی مناظر کو اپنی آنکھوں میں بھر کر وہ لفظوں کے پیکر میں ڈھالتی ہیں:

ریشم کے ہریالے پتے/ ہولے ہولے جھوم رہے ہیں/ گہرے نیلے آسمان کو/ اندھیارے اب چوم رہے ہیں/ چاند کی کرنیں، اوس کی بوندیں/ رات رانی کی پنکھڑیاں/ بھینی خوشبو/ دھیما سا اک پون کا جھونکا/ چنچل بھونرے گن گن کرتے/ جھینگر کنٹھ میں پلتی شام۔

بقول کملیش بخشی:

''صادقہ کا کوی من مناظر قدرت کا دلدادہ ہے۔ آسمان کے بدلتے رنگ ہوں یا چمپئی سیورا ہو، روپہلی چاندنی رات ہو یا بھیگی برسات ہو، اگھن پوس کی ٹھنڈی ہوائیں ہو یا پت جھڑ کی صدائیں۔ سبھی کو انہوں نے مرتسم کیا ہے۔''

شاعرہ کا کہنا ہے کہ محنت ہی ہمیں نئے راستے دے گی۔ جدو جہد شرط ہے۔ عورت کو اپنے حق کے لیے لڑنا چاہئے۔ جھوٹی شرم کو طاق میں دھرنا چاہئے۔ چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے تو اسے صدیاں گذر گئیں۔ اکیسویں صدی میں اپنے عزم اور ارادے سے وہ ان تمام بیڑیوں کو اتار پھینکے گی جو مردوں نے اس کے ہاتھ پاؤں میں پہنائی ہیں۔ ان کویتاؤں میں آزاد جینے کی خواہش چپے چپے پر مچل رہی ہے۔ ''شاپ''، ''وہ ایک جہاں''، ''تصور شکن''، ''آرزو''، ''آج اور کل''، ''عوض'' اور ''آنکھوں کی پیاس'' وغیرہ کویتاؤں میں سحر کی بے حد نجی خواہشات، داخلی کیفیات اور شخصی محسوسات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

باغ ہستی کی مہک ہر پھول کو ملتی رہے
ہر گذشتہ یاد دل میں مثلِ گل کھلتی رہے

''جہاد اور جنگ''، ''سانپ خوف کے''، ''امریکہ کے ایک اسکول میں''، ''بھیک''، ''کالے سپیرے''، ''بھوکمپ''، ''اس جہاں کا کیا ہوگا''، اور ''لاش'' وغیرہ کویتاؤں میں عصر حاضر کی المناکیاں ہیں۔ انسانیت سوز واقعات کا ماتم ہے۔ مفادات کے نشتر ہیں اور جلتے گھروں کا دھواں ہے۔ مہذب کہلانے والے انسانوں کی خودغرضیاں ہیں۔ بھارت ماں کی نمناک آنکھیں ہیں جس کے بچے مندر اور مسجد کے نام پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔

مگر اب کیا ہوا بیٹو! / یہ آپس میں لڑائی کیوں / کہ بھائی بھائی کے سینے میں خنجر گھونپ

کر خوش ہے۔

سحرؔ کے سامنے ان مہان آتماؤں کے آدرش ہے جنہوں نے بھٹکتی دنیا کو راستہ دکھلایا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر، مہاتما گاندھی نے اندھیروں میں دیپ جلائے ہیں۔ انسانیت کے ایوانوں کو محبت کے پھولوں سے سجایا ہے۔ امبیڈکر نے کیڑے مکوڑے کی طرح جیتے انسانوں کو جینا سکھلایا۔

انسان کوانسان کی پہچان دے گا
بے جان تھے شری انہیں جان دے گا

'ماں' نظم میں ایک ایسی بیٹی کے جذبات قلم بند ہوئے ہیں جس کی ماں آج اس دنیا میں نہیں ہے۔ ماں کے وجود کی کمی اسے ہر پل محسوس ہوتی ہے۔

کیوں ناراض ہوئی ہوا ایسے/ خواب میں تو مل جاؤ/ زخم میرے سل جاؤ

کویتا 'ماں نہیں ہے' میں ماں کے جانے کے بعد جس خالی پن کا احساس ہے، اسے الفاظ دیے گئے ہیں۔

ماں کا چشمہ ماں کی کتاب/ وہی پڑی ہیں/ ماں ہی نہیں ہے!

دنیا بھر کی ساری دولت بھی عمر بھر ماں کی کمی کو پورا نہیں کرسکتی۔ ممتا کے بانہوں کی مہک، نرمی، گرمی، الفت، بے لوث و بے غرض ایثار وقربانی کو بھلا کس ترازو میں تولا جاسکتا ہے؟ 'ماں اور میں' اس کویتا میں سحر کو محسوس ہوتا ہے کہ ؂

کیسے تم میری آنکھوں میں جذب ہوئیں
میری ہستی میری سانسوں میں گھل گئیں

جیسے ماں انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں گئیں بلکہ ان کے وجود کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔

ماں پر لکھی تین نظمیں ماں اور بیٹی کے گہرے پیار کی ترجمان ہیں۔ یہ ان لوگوں کے لیے تازیانہ ہے جو ماں اور باپ کو فالتو کی چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ نئی تہذیب نے ان رشتوں کی پاکیزگی، بے لوث و گہرائی کو بھی ان دیکھا کیا ہے۔ چونکہ نئی پود اپنے لیے جیتی ہے، اپنے

لیے سوچتی ہے، بوڑھے لوگ نئی پود کے لیے فاضل بن چکے ہیں۔

صادقہ نواب سحرؔ کے پتھروں کے شہر سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایک ایماندار دل اور غور وفکر کرنے والا دماغ ہے۔ ان کے ادراک کی افق پر جذبوں کی کہکشاں بکھری ہوئی ہے۔ اپنے اردگرد کی دنیا سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔ اپنے اندر کی دنیا کی تمام ہلچل بھی انہیں سیماب کی طرح بے چین رکھتی ہیں۔ وہ دنیا کو کچھ دینا چاہتی ہیں۔ ان کے اندر بیٹھی شاعرہ اپنی کاوشوں سے ابھی غیر مطمئن ہے۔ ان کی سوچیں ہر پل انگڑائیاں لیتی ہیں۔ تجربات اور واردا تیں خانہ دل پر لگا تار دستک دیتی ہیں۔ احساسات کا آتش کدہ دہکتا رہتا ہے۔ جستجو کا لاوا پھٹتا رہتا ہے۔ دنیا بھر سے پیار کرنے والا دل مچلتا رہتا ہے اور پل پل تلخ حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش بھی ہوتا رہتا ہے اور جذبوں کے انہیں مدوجزر کے بیچ شاعرہ کا قلم صفحۂ قرطاس پر الفاظ کے موتی بکھیرتا رہتا ہے۔ اس میں نشاط انگیز طمانیت بھی ہے اور روح فرسا تشنگی بھی، دل گرفتگی کی مدھم آنچ بھی ہے اور اعتماد کا سورج بھی، کرب کی لذت بھی ہے اور تصور کی ندرت بھی، خوابوں کی دھنک بھی ہے اور آگہی کی دولت بھی۔

سحرؔ کی تحریر میں سادگی، روانی اور تاثیر ہے۔ اردو اور ہندی کا گنگا جمنی ذائقہ ولطف تادیر قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی دلکشی میں اضافہ ہوگا اور نکھار آئے گا۔ جذبات کی تڑپ اور اس کا پرخلوص اظہار ہی ان کی شاعری کی جان ہے۔

اک درد سا سینے میں ہمارے بھی جواں ہے
پتھرائی ہوئی آنکھیں ہیں خاموش زباں ہے

(نوائے ادب، ممبئی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء)

☆☆☆

زندگی کے بڑے سمندر کی شاعرہ: صادقہ نواب سحر

ڈاکٹر شوبھ ناتھ یادو

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر صادقہ نواب غزل کی دنیا میں اپنا پختہ مقام بنا چکی ہیں۔ یہاں اب وہ نظم اور کویتا کے نئے انداز اور احساس میں اپنی نئی پہچان لے کر آئی ہیں۔ وہ اپنے اندر محبت، بے چینی اور درد کا عالم سمیٹ کر ان نظموں میں اتری ہیں مگر ان کی محبت کا یہ عالم اپنے نجی زندگی سے نکل کر فطرت کے حسن سے گزرتا ہوا انسانیت کی خالص محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان میں محبت اپنے ذاتی تالاب کے دائرے میں محدود نہ ہو کر زندگی کے بڑے سمندر میں سما جانے کے لئے بے چین لگتا ہے۔ یہی ان کی محبت کا اعجاز ہے۔ تب ان کے لئے انسان نہ ہندو رہ جاتا ہے نہ مسلمان۔ اس طرح فرقہ پرستی میں بنٹی ہوئی تمام انسانیت شرمندہ ہو جاتی ہے اور قبیلوں، سمپردائیوں، جاتیوں میں سمٹ کر خونخوار بن جاتی ہے۔ تب وہی اپنی ہی اصلی انسانی قوم کو پہچان نہیں پاتی ہے اور اس پر خود وار کرتی ہے۔ تب ایسی اصلی انسانیت بے قدر لہولہان ہوتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ کو یہ بات لگاتار بے چین کرتی رہتی ہے۔ ایسی بے چینی کبھی درد، کبھی آدرش کے ٹوٹنے اور کبھی طنز بن کر ان کی نظموں میں پھیلی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صادقہ کی ان نظموں میں محبت کے علاوہ قدرت کا حسن بھی لبریز ہو کر رواں ہے کیونکہ محبت اور حسن دونوں ہی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر یہ حسن الگ سے نہیں بلکہ انسان کی حرکتوں اور احساسات میں ہر طرف ظاہر ہوتا ہے۔ اسی نکتہ پر آکر صادقہ کی شاعری انسانی حسن کے بڑے فلک پر اترتی نظر آتی ہے۔ 'ڈھلتی شام'، 'برکھا رت' اور دوسری

نظموں میں فطرت کا ایسا فلک واضح طور پر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر صادقہ نے زمانے کے درد اور انقلاب کی بات بھی اپنی ان نظموں میں بخوبی ظاہر کی ہیں۔'لاشیں'، 'پتھروں کا شہر'، 'انقلاب کی آہٹ'، 'شاپ'، 'مانو بلی'، 'جہاد اور جنگ' اور 'کالے سپیرے' وغیرہ زمانے کا یہ درد صادقہ کو اپنے نجی خول سے باہر نکالتا ہے اور سماج کے بڑے درد سے گہرے جوڑ دیتا ہے۔

ڈاکٹر سحر نے اس پورے مجموعے میں کچھ ایسی بہترین نظمیں ہیں جو میرے ذہن پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں جن میں 'ٹوٹتے آدرش'، 'ڈھلتی شام'، 'ایک بیتی زمانے کے خداؤں سے'، 'اپنے محسن سے'، 'لاشیں'، 'پتھروں کا شہر'، 'مانو بلی'، 'جہاد اور جنگ'، 'کھنڈر'، 'بھیک'، 'موکش'، 'گلہ'، 'کالے سپیرے'، 'سوال'، 'رب کی عنایت'، 'ماں ہی نہیں ہے'، 'غالب سے' قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر صادقہ نواب کو جب میں تخلیق کار کے روپ میں دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ایک طرف وہ محبت کا بے چین خوبصورت نغمہ ہیں تو دوسری طرف درد کا اچھلتا دریا بھی۔ ایک طرف عورت کی آزادی کا پیغام ہیں تو دوسری طرف تمام انسانی جذبات کی جدو جہد بھی۔ایک طرف اپنی ہی زندگی کی دیواروں کو ڈھانے کا اعلان ہیں تو دوسری طرف سماج کی غلط غلیظ مانیتاؤں رسموں کو منہدم کرنے کا انداز بھی۔ یہ سب ممکن ہوتا ہے ان کی سادہ سہج وسیال ترل حسیت کے ذریعے جس میں گہرے احساسات کے ساتھ ایک انسان یا ایک عورت کی آزادی کو پر زور ڈھنگ سے اجاگر کیا گیا ہے۔ میں ڈاکٹر صادقہ کو مبارکباد دیتا ہوا یہ امید کرتا ہوں کہ وہ اپنی روح کی آزادی کی اس سفر میں مسلسل آگے بڑھتی رہیں گی۔''

(پتھروں کا شہر، صادقہ نواب سحر، سحر پرکاشن کھوپولی، مہاراشٹر، ۲۰۰۳ء)

شاعری کی ملکہ ڈاکٹر نواب سحر

وفا اعظمی

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی)

کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو زمانے کو سپرد ہو جایا کرتے ہیں لیکن بعض شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے سپرد زمانہ ہو جایا کرتا ہے۔ شاعری کی ملکہ کہی جانے والی ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا شمار بھی دوسرے زمرے کی شخصیات میں ہوتا ہے۔ مہاراشٹر کے کھپولی علاقہ کی وادی میں رہتے ہوئے تدریس و تصنیف کی خوشبو بکھیرنے والی اس ادیبہ کی خصوصیات اور آئیڈیالوجی کے بارے میں بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ آج تک کسی بھی شاعر، شاعرہ اور ادیب کی غزلوں، نظموں اور نثری تحقیقات کے بارے میں اتنی بڑی تعداد میں تنقیدی اور تاثراتی مضامین نہیں لکھے گئے جتنے ان کے حق میں آئے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ان کے ادبی جادو نے ایسا کمال پیدا کر دیا کہ ہر کوئی ان کے سحر کے جال پھنستا چلا گیا۔

صادقہ + نواب + سحر = ایک ایسا منظوم سنگم ہے جس میں سماج کی تصویر پوری ایمانداری، دیانتداری اور صداقت کے ساتھ شاعری کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ ان غزلوں اور نظموں میں ایسے ناقابل تسخیر شواہد، بیّن ثبوت اور پختہ دلائل ہیں جن پر چوں چرا کیے بغیر بڑے سے بڑے نقاد اور تنقید کے شہسواروں کو لبیک کہتے ہوئے شکست سے دوچار ہو پڑتا ہے کیونکہ ان شواہد، ثبوت اور دلائل میں ایک ایسا جادو ہے جو قارئین کے رگ و پے اور ان کے پورے وجود کو مسحور کر دیتا ہے۔ ایسا سحر جو ہوش کو کھوتا نہیں ہے بلکہ دل و دماغ کو اور بھی تروتازہ بنا دیتا ہے۔ ایسے ہی سنگم کا نام ڈاکٹر صادقہ نواب سحر ہے۔

اردو + ہندی + انگریزی = ایک ایسا مثلث ہے جس کا تینوں سرا خود بہ خود

لسانیات کی ماہر اس ادیبہ کی طرف مُڑ جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف اردو طبقے کی برسوں سے لگی عطش اور عرصے سے محسوس کی جانے والی بھوک کو مٹانے کی کوشش کی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی کے متوالوں اور دیوانوں کو بھی دیوانگی کا ایسا ادبی مشروب پلا دیا ہے جو انہیں تا حیات لطف اندوز اور سیراب کرتا رہے گا۔ ایسے مثلث کو جہانِ ادب میں ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تدریس + تصنیف + تقریب = ایک ایسا آئینہ ہے جو حق و باطل میں تمیز پیدا کر کے اصل حقیقت کو معاشرے سے روبہ رو کراتا ہے۔ تدریسی خدمات ہوں یا تصنیفی ذمے داریاں یا پھر ادبی تقریبات ہر تین عظیم محاذ پر اپنی کامیابی کے پرچم لہرا دینا ایک خواب کے مانند ہے۔ اسکولی بچوں میں بے پناہ مقبولیت، تالیفی میدان میں حد درجہ شہرت اور تقریری پروگراموں میں لاجواب ندرت کے حامل اسی آئینہ کو ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کہا جاتا ہے۔

اردو اکادمی، دہلی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، معروف ادبی رسالہ 'شاعر' ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی، اردو ادب کا مستند رسالہ 'استعارہ' دہلی کے سابق معاون ایڈیٹر حقانی القاسمی اور رفیعہ شبنم عابدی جیسے قلم کے شہسوار اگر کسی تحریر کی صرف نوک پلک سنوار دیتے ہیں تو اس تخلیق کی تقدیر بدل جاتی ہے لیکن اگر وہ کسی تخلیق کو اپنی سند عطا کر دیں تو پھر اس کی پختگی، عمدگی اور کامیابی کا اندازہ صرف اور صرف لگایا جاسکتا ہے۔

میں نے ڈاکٹر صادقہ صاحبہ کی تصنیفات، ناول، غزلوں، نظموں اور ڈراموں کے مجموعے کا باضابطہ طور سے مطالعہ تو نہیں کیا لیکن این سی پی یو ایل، دہلی میں ان کی آمد کے موقع پر دو سال قبل ہوئی ان سے ملاقات کے بعد میں اس قدر متاثر ہوا کہ ان کے بارے میں ہندوستان کے کم و بیش 250 معروف ادبا اور ناقدین کی تحریریں پڑھ ڈالیں اور تقریباً سبھی کو میں نے ڈاکٹر صادقہ کی تخلیقی کاوشوں اور تحقیقی کوششوں پر لبیک کہتے ہوئے پایا۔ جن پایے کے نقادوں، ادیبوں اور شاعروں کے تاثرات کا میں نے مطالعہ کیا، ان میں جوگیندر

پال، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، قمر رئیس، سلام بن رزاق، رفیعہ شبنم عابدی، مجتبیٰ حسین، علی احمد فاطمی، حقانی القاسمی، ندا فاضلی، افتخار امام صدیقی، نگار عظیم، مناظر عاشق ہرگانوی، اسلم جمشید پوری، پیغام آفاقی، مسرور جہاں، وسیم بیگم، صالحہ صدیقی، ڈاکٹر وکرم چوپڑہ، شائستہ فاخری، کالی داس گپتا رضا، دامودر کھڑسے، مادھوری چھیڑا اور نغمہ جاوید ملک و دیگر کے نام قابل ذکر ہیں۔

میں یہاں نثری خدمات پر کچھ نہ کہتے ہوئے صرف ڈاکٹر صادقہ نواب کی نظموں سے متعلق چند معتبر اور مستند اردو اور ہندی کی شخصیات کے حوالہ جات پیش کر رہا ہوں:

شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''آپ کا مختصر سا مجموعہ کلام ''انگاروں کے پھول'' ملا تھا۔ شکریہ۔ میں نے اسے جگہ جگہ سے پڑھا اور جگہ جگہ مجھے اچھے اچھے شعر نظر آئے۔ میں بھی جناب رفیعہ شبنم کی آواز میں آواز ملا کر کہتا ہوں کہ آپ کا آغاز سفر خوشگوار انجام کی خبر دیتا ہے۔''

قمر رئیس نے ڈاکٹر صادقہ کی نظموں کو سند عطا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ کے بعض اشعار اور خصوصیت سے آپ کی نظموں میں انسانی دردمندی اور آشوبِ حیات کا احساس بھی ہوتا ہے۔''

'شاعر' ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی کی نظر میں ڈاکٹر صادقہ کی نظموں کی حیثیت کچھ اس طرح ہے:

''ان نظموں میں اگر آپ بیتی ہے تو جگ بیتی بھی ہے بلکہ دونوں کے امتزاج سے ہم بیتی والی نظمیں بھی ہیں۔ صادقہ کا حساس شعور، اس کی سوچ آنکھیں، خیال سمندر، اتنا تند و تیز ہے کہ بعض اوقات وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ پاتی اور نظموں میں منعکس ہو جاتی ہے۔''

رفیعہ شبنم عابدی ڈاکٹر صادقہ نواب کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''صادقہ کی شاعری میں اپنے عہد کی دیگر شاعرات کی طرح نسوانی جذبات واحساسات کی عکاسی ضرور ملتی ہے مگر خوشی اس بات کی ہے کہ اُس نے اپنی شاعری پر آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کے نام نہاد نعروں کا لیبل چسپاں نہیں ہونے دیا جو آج ہر شاعرہ کے ہاں ایک فیشن کے طور پر چل پڑا ہے۔''

کالی داس گپتا رضا، ممبئی نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''صادقہ نواب نے بیشتر غزلوں کیلئے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا ہے اور یہ دونوں ہی باتیں ایک عورت کو ہر طرح زیب دیتی ہیں۔ کہیں کہیں غزل کا معیار خاصہ بلند ہوگیا ہے، اگرچہ زبان وہی سلیس رہی ہے اور کہنے کا ڈھنگ وہی میٹھا ہے۔''

معروف نقاد اور استعارہ دہلی کے سابق معاون ایڈیٹر حقانی القاسمی کہتے ہیں:

''ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نظموں کے اس خوبصورت احساس کی حامل ہیں جو خزاں کو بھی بہار میں بدل دیتا ہے اور ریگ زار کو بھی گلزار بنا دیتا ہے۔ وہ بہت مثبت اور تعمیری ذہن رکھتی ہیں۔ ہر باب میں ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔''

ڈاکٹر نواب کے بارے میں ہندی کے رائٹر دامودر کھڑسے کا تاثر کچھ یوں ہے:

''صادقہ نواب سحر اپنی نظموں میں بہت رجائی ہیں۔ زندگی کی تمام کجیوں اور چیلنجوں کو وہ بہت باریکی اور نزاکت سے ڈھالتی ہیں۔ ان کا آخری نتیجہ زندگی کی امید، آدرش اور وفاداری فرد کا آئیڈیل ہے۔''

زندگی کی تلخیوں اور بدصورتیوں کے حوالے سے سماج کو آئینہ دکھانے والی ڈاکٹر صادقہ نواب صاحبہ ایسی زندہ دل شخصیت کی حامل شاعرہ ہیں کہ جو بے پناہ مصروفیت اور تدریسی خدمات انجام دینے کے باوجود سماجی برائیوں اور مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتی رہتی ہیں۔

میں گرچہ ڈاکٹر صادقہ نواب کے ناولوں، ڈراموں، نثر اور شاعری کو نہیں پڑھ سکا

لیکن مجھے دلی فرحت ومسرت کا احساس ہے کہ ان کی ادبی شخصیت کے حوالے سے معروف ادبا اور نقادوں کے تاثرات، مضامین اتنی بڑی تعداد میں میرے حصے میں آئے جس سے ڈاکٹر صاحبہ کی عظمت، لیاقت، مہارت، شرافت اور دیانت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر صاحبہ کی شاعری مطول بھی اور مختصر بھی۔ ان کی شاعری روئے زمین پر رونما ہونے والے ان واقعات وسانحات کا احاطہ ہے جس کو بعض اوقات سماج بیان کرنے میں عار محسوس کرتا ہے۔

الغرض ڈاکٹر صادقہ صاحبہ کی نظموں اور غزلوں میں صداقت بھی ہے، نوابیت بھی ہے اور سحر بھی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆☆☆

اکیسویں صدی کی تانیثی شاعرات

(صادقہ نواب سحر کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ)

صالحہ صدیقی

(ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی یونیورسٹی)

صادقہ نواب سحر کا شمار بھی اردو کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہیں۔ یہ اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں میں شاعری کرتی ہیں۔انھوں نے بہت کم وقت میں اپنی قابلیت اور فنی بصیرت، اپنے انوکھے انداز، تکنیک، ہیئت، موضوعات و تلازمات اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر اردو شاعری و فکشن کی دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔صادقہ نواب سحر کی پیدائش ۸/اپریل ۱۹۵۷ء کو گنٹور آندھرا پردیش میں ہوئی۔ان کے والد کا نام خواجہ میاں شیخ صاحب تھا جب کہ والدہ کا نام شرف النساء تھا۔آپ کے شوہر کا نام اسلم نواب ہے۔آپ نے ماسٹر کی ڈگری تین زبان اردو 1981، ہندی 1993، اور انگریزی 1987 میں ممبئی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔اس کے علاوہ آپ نے پی۔ایچ۔ڈی بہ عنوان ''ساٹھوتری ہندی غزل'' پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری 1999 میں حاصل کرنے کے ساتھ ڈی۔ایچ۔ای کی اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کیں۔اس وقت آپ درس و تدریس کا کام بحثیت صدر شعبۂ ہندی کے ایم سی کالج کھپولی، ضلع رائے گڑھ مہاراشٹر میں انجام دے رہی ہیں۔

صادقہ نواب سحر ایک ہمہ جہت شخصیت کی مالک انسان ہیں، یہ صرف فکشن نگار نہیں بلکہ شاعرہ بھی ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اردو ہندی دونوں ہی زبانوں میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔نثر میں بھی یہ کسی ایک صنف تک محدود نہیں ہیں بلکہ

انھوں نے مختلف صنفوں میں مثلاً ڈرامہ، افسانہ، ناول، اور تخلیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ تراجم میں بھی دست آزمائی کی ہیں۔

اگر ہم صادقہ نواب کی شعری تخلیقات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' 1996 میں منظر عام پر آیا، ''پھول سے پیارے جگنو'' (بچوں کی نظمیں) 2003 میں شائع ہوا، اردو کے علاوہ ہندی میں ان کا کویتا سنگرہ ''پتھروں کا شہر'' (ہندی نظموں کا مجموعہ) بھی منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کے غزلوں کا مجموعہ ''دریا کوئی سویا سا'' اور ''چھوٹی سی یہ دھرتی'' (نظموں کا مجموعہ) بھی منظر عام پر آ کر داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب دنیا دن دونی رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے۔ انٹرنیٹ، فیس بک، یوٹیوب، موبائل کا زمانہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں خواتین شاعرات کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ نہیں کہ عورتیں لکھنا نہیں جانتیں یا لکھ نہیں سکتیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ خواتین شاعرات کو آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی خواتین شاعرات کو اس عزت وقدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کی وہ مستحق ہیں لیکن اس کے باوجود بھی عورتیں کبھی پیچھے نہیں ہٹیں۔ عورت کی اس بے چارگی کا سبب مردانہ تسلط کا سماج، قدیم روایتوں اور مذہبی ضابطوں کے علاوہ اس کا معاشی حیثیت سے مرد کا مرہون منت ہونا ہے۔ عورتوں کے حق میں اٹھنے والی آوازوں میں ایک آواز ''تانیثیت'' کے نام سے آج فروغ حاصل کر رہی ہے۔ اس تحریک کا بھی مقصد عورت کی زندگی سے متعلق مختلف گوشوں میں جا کر ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنا اور ان کے حقوق کے فراہمی کے لیے صدا بلند کرنا ہے۔ عورتوں میں ان سب کے علاوہ بیداری پیدا کرنا ہے تا کہ وہ اپنے جائز حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں اور سماج میں عزت کی زندگی بسر کر سکیں۔ اردو میں بھی یہ آواز گونجی اور بہت سی شاعرات نے اپنے دکھ درد کو شعری پیرائے میں پیش کیا۔ آج اردو ادب میں ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں عورتیں شاعری میں دست آزمائی کر رہی

ہیں جس کے سبب ہمارے سامنے خواتین شاعرات کی ایک لمبی فہرست ہیں لیکن جن شاعرات نے ادب کی دنیا میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا اور ممتاز ادیب ونقادوں کے درمیان اپنا مقام مستحکم کیا، ان میں شفیق فاطمہ شعریٰ، شاہدہ حسن، سارا شگفتہ، نسیم سیدّ، رفیعہ شبنم عابدی، حمیرا رحمٰن، عشرت آفریں، ریحانہ قمر، شبنم عشائی، نزہت صدیقی، گلنار آفریں، ساجدہ خاتون، بلقیس ظفیر الحسن، عذرا پروین، پروین فنا، فرخ زہرا گیلانی، حمیدہ معین رضوی، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، زہرہ نگار، شہناز نبی، صادقہ نواب سحر، فریدہ رحمت اللہ، شاہین مفتی، تسنیم عابدی، صوفیہ انجم تاج، پروین شیر، اندرا شبنم اندو، شاہدہ نسیم سالک، انوری بیگم، شہلا نقوی، ترنم ریاض، نصرت آرا چودھری، شبنم عشائی، سیدہ نسرین نقاش، رخسانہ جبیں، سلطانہ مہر وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ان خواتین شاعرات نے نظموں اور غزلوں کے ذریعے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور اپنے اوپر صدیوں سے ہو رہے مظالم کے خلاف احتجاج بھی بلند کیا۔ بقول قمر جہاں:

> ''خواتین کے یہاں مرداساس معاشرہ سے بغاوت کا لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا جا رہا ہے۔اب وہ وفا کی دیوی، اور حیا کی مورت کی جگہ ایک نئے پیکر میں اُبھر رہی ہیں، جہاں اپنے وجود اور اپنی ذات کا احساس ہی ان پر حاوی ہے۔''

صادقہ نواب سحر کی شاعری آج کے عہد کی عورت کی داستان ہے۔ادب ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خواب وخیال، احساسات و جذبات، مسرت وغم، اپنی خواہشوں اور محرومیوں کے ساتھ اپنی زندگی کے حقیقی تجربات کی عکاسی وترجمانی کرتا ہے۔ نثر ہو یا شاعری مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ ادب کو بنایا۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی طویل عرصے سے اس کا اہم جزء رہی ہیں، اور عورتوں نے اپنے اعتبار سے اپنے تخلیقی تجربات کو ادب وشاعری میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اپنے کمال فن کا مظاہرہ بھی بڑی ہنرمندی سے کیا ہے لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہیں کہ عورتیں لمبے عرصے تک اپنے اظہار خیال کو شاعری کے ذریعے کرنے سے محروم رہیں، اس کی وجہ یہ ہے

کہ باعزت اورشریف گھرانوں کی خواتین کا شعروشاعری کرنا معیوب سمجھا جاتا تھااور اگرقلم اٹھانا بھی چاہاتو روایت اور معاشرت کی سخت پابندیوں نے ان کے ہاتھ روک دیے۔اس زمانے میں شعروشاعری کوعیب مانا جاتا تھا، چونکہ اس فن کا تعلق بالعموم کوٹھے اور طوائفوں سے تھااس لیے اس فن کوشہزادیوں اور رئیس زادیوں کے لیے معیوب مانا جاتا تھا۔مظلوم طبقہ کب بغاوت کا روپ دھارن کر لے، کہانہیں جا سکتا۔عورتوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، جب ان سے آزادی چھینی گئی تو انھوں نے اظہار خیال کے نئے زاویے اختیار کیے، انھوں نے کھل کرلکھنے کی بجائے پوشیدہ طور پرقلم فرسائی کی مراد یہ کہ انھوں نے مردوں کے نام سے لکھالیکن آگے چل کر بدلتے وقت کے تقاضے کے ساتھ جب سوچ میں تبدیلیاں رونما ہونےلگیں اورعورتوں کے حصے کچھ آزادی آئی تو انھوں نے نثر کے ساتھ شاعری بھی کھل کرکرنی شروع کردی۔ایک عورت چونکہ مردوں کے مقابل زیادہ حساس اور سنجیدہ ہوتی ہےاور زندگی کے ہرچھوٹے بڑے لمحات کوقریب سے جیتی اور محسوس کرتی ہے،لیکن جب وہ ماں بنتی ہےتو یہ احساس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ماں کی صورت میں اس کے ذہن ودل میں لوری کا روپ لیے شاعری کا یہ سرچشمہ بہنا شروع بھی ہو جاتا ہے۔اس طرح شاعری کہیں نہ کہیں ان کے رگ وپے میں بھی سرایت کرتی ہے، بقول ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

> ''عورت کی سرشت میں شاعری کا خمیر مرد سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔
> اپنے ننھے منے بچوں کولوریوں کی مدھم دھنیں سنا کر آہستہ آہستہ سلا دینا ،اس
> جہاں کی عورت کاایک محبوب مشغلہ رہاہے،اس اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا کی
> ہرعورت فطری طور پرشاعرہ ہوتی ہیں۔''

ہندوستان میں شاعرات کی ایک طویل تاریخ رہی ہیں۔آزادی سے قبل شاعرات کی ایک لمبی فہرست ہمیں دیکھنے کوملتی ہے جنھوں نے کھل کراپنے خیالات کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا، بقول ڈاکٹر نجمہ صدیقی:

> ''معلوم تاریخ کے مطابق عورت اور لفظ کا رشتہ تقریباً تین ہزار سال

سے قائم ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں محفوظ شاعری کے نمونوں سے لے کر
آج تک عورت نے انفاس وآفاق کے درمیان پھیلی ہوئی اس دنیا میں جو سوچا،
جو محسوس کیا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے۔ مظلومی اور محرومی
سے شعور وآگہی اور اختیار واعتبار کا یہ سفر اپنے جلو میں جدوجہد کی ایک روشن
تاریخ لیے ہوئے ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی اہمیت اور اس کے حق
کا اعتراف کیا جائے۔''

صادقہ نواب نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ اردو شاعرات کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی شاعری میں عورت کے احساسات و جذبات، درد والم کو بڑی چابک دستی سے برتا گیا ہے۔ اس کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہندوستانی تاریخ میں عورتوں کے اہمیت، اس کی حیثیت، اس کے ساتھ ہونے والے سلوک سے خاصی واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ تقریباً ہر دور میں عورت مظلوم اور حق وانصاف کی طلب گار رہی ہے۔ صدیوں سے اس پر مردوں کا جابرانہ تسلط قائم رہا ہے اور وہ مختلف طریقوں سے ان کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ مرد نے اس کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط کرنے کے لیے اسے سماجی نظام کے حصار میں ایسا محصور کیا کہ اس کی پوری شخصیت ریزہ ریزہ ہوگئی۔ کبھی وہ لونڈیوں کے درجے میں رکھی گئی، تو کبھی بازاروں اور میلوں میں خریدی اور بیچی گئی، کبھی اسے مجسم گناہ تو کبھی گناہوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ کبھی اسے ملکیت اور وراثت کے حقوق سے محروم کیا گیا، تو کبھی اسے موت سے بھی زیادہ تلخ کہہ کر حیوان سے بدتر سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔ کبھی اس کے وجود کو باعث ننگ سمجھ کر زندہ درگور کیا گیا تو کبھی شوہر کی چتا پر زندہ جلنے پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ آگے چل کر ایسا بھی وقت آیا جب عملی زندگی میں عورت کو برابر کا شریک مانا گیا اور اسے پوری عزت و اہمیت کا حامل بھی سمجھا گیا۔ تاریخ میں ایسا وقت بھی آیا جب عورت نے زمانے کی حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھالی، تو کہیں اسے قبیلے اور خاندان میں عزت اور وقار کی زندگی میں بھی دیکھا گیا، لیکن ان سب کے باوجود بہ حیثیت مجموعی عورت زیادہ تر مظلوم رہی۔ غرضیکہ دنیا کے

بیشتر تہذیبی مراکز میں عورت مظلوم اور بے بس تھی۔اس کے تئیں استبداد و استحصال کے مختلف زاویے اپنائے گئے تھے۔

اس طرح یہ تمام مسائل عورت کی راہ میں کانٹے کی طرح چبھتے رہے اور اس کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتے رہے۔کبھی مذہب تو کبھی اس کے فرسودہ روایات میں جکڑ کر اس پر مردوں نے اپنی طاقت کی آزمائش کی۔اس کو ہمیشہ گری ہوئی نگاہوں سے اور اپنے سے کمتر سمجھا، لہٰذا عورت ازل سے اب تک ان تمام مسائلوں کا سامنا کرتی آرہی ہے۔حالانکہ اس کے حقوق کے لیے آوازیں بھی اُٹھتی آئی ہیں لیکن تمام تر تحریکات اور نعرے بازی کے باوجود بھی عورت محض تفریح ولذت کی فراہمی کا ذریعہ سمجھی جاتی رہی ہے اور عورت کی اس بے چارگی کا سبب مردانہ تسلط کا سماج،قدیم روایتوں اور مذہبی ضابطوں کے علاوہ اس کا معاشی حیثیت سے مرد کا مرہون منت ہونا ہے۔عورتوں کے حق میں اٹھنے والی آوازوں میں ایک آواز ''تانیثیت'' کے نام سے آج فروغ پارہی ہے۔اس تحریک کا بھی مقصد عورت کی زندگی سے متعلق مختلف گوشوں میں جاکر ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کرنا اور ان حقوق کے فراہمی کے لیے صدا بلند کرنا ہے اور عورتوں میں ان سب کے علاوہ بیداری پیدا کرنا ہے، تاکہ وہ اپنے جائز حقوق کے لیے آواز بلند کرسکیں اور سماج میں عزت کی زندگی بسر کرسکیں۔ صادقہ نواب کی شاعری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ان کے کلام کے اوصاف پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

> ''سچ پوچھئے تو میں نے پہلی بار اردو کی ایک ایسی پاک دامن شاعرہ کا کلام پڑھا جس میں شوہر اور شریعت کی پابندی اور وفاداری کو کلیدی حیثیت دی گئی ہے۔ساری دنیا میں عورت آزادی اور مرد کے مساوی حقوق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ یہ رویہ بھی ایک طرح کی بغاوت ہے۔ ہر چند کہ یہ بغاوت عورت کو مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف اور آزادی کے بجائے تابعداری اور غلامی کی طرف لے جاتی ہے تاہم اس نوع کی بغاوت اور آزادی کا حق بھی آپ کو

حاصل ہے۔''

(بحوالہ: رسالہ ''شاعر'' (ممبئی)، شمارہ ستمبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۸)

ہر معاشرہ میں عورت کی حالت و حیثیت کو سماج کے مرد حضرات کمزور و ناتواں سمجھتے رہے۔ ہماری شاعرہ مرد اساس سماج طبقہ سے جو مطالبہ کرتی ہیں وہ بحیثیت مجموعی یہی ہے کہ ہمیں بھی جینے کا حق اتنا ہی حاصل ہے جتنا تمھیں ہے۔ عورت کا یہ مطالبہ دراصل مرد سے مساوی حقوق کا مطالبہ ہے۔ یہ مطالبہ حق بجانب جائز مطالبہ بھی ہے جو اسے ملنا ہی چاہیے۔ آج مغرب کے ساتھ ساتھ مشرق میں بھی عورت کا تقدس پامال ہو گیا ہے۔ اہل مشرق بھی اب مغرب کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر عہد کی طرح اس عہد میں بھی عورت مظلوم، محکوم بنی ہوئی ہے جس کے لیے کبھی ساحرؔ لدھیانوی نے بھی کہا کہ ؂

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کہ ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدسِ مشرق کہاں ہیں

بانو قدسیہ کی شاعری میں بھی یہی رنگ دیکھنے کو ملتا ہیں۔ صادقہ نواب کی شاعری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہیں کہ وہ مردوں کو نیچا دکھانا، یا ان سے بغاوتی تیور میں لڑتی جھگڑتی انھیں کھرا کھوٹا نہیں سناتیں بلکہ زندگی کے سفر میں اس کا ساتھ چاہتی ہیں، جس میں محبت ہو، شفقت ہو، عزت ہو اور جینے کا حق ہو، اپنی مرضی سے سانس لینے کی آزادی ہو اور اس آزادی میں بھی وہ اپنے ساتھی کو شامل حال پانے کی خواہش کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں مشرقی نازنین کی خوبصورت خواہشات نظر آتی ہیں جو زندگی کے سفر میں اپنے ہم سفر کا ساتھ چاہتی ہیں، جو اپنی ایک خوبصورت دنیا چاہتی ہیں۔ جو اپنی تہذیب و تمدن، اپنے معاشرے اور اپنے سماجی اقدار کی بھی قدر کرتی ہیں۔ جو یکتا کی طاقت پر یقین رکھتی ہیں اور جو اپنوں کے ساتھ مل کر چلنا چاہتی ہیں۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تعلق کا بہانہ چاہتی ہوں
اسے اپنا بنانا چاہ ہوں
نہیں ہے شک وفاداری پہ اس کی
ذرا سا آزمانا چاہتی ہوں
میں عورت ہوں یہ فطرت ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں
روایت سے سحرؔ رشتہ ہے میرا
وہی رشتہ پرانا چاہتی ہوں

....

کوئی ہمدرد غمگسار ملے
زندگی بخش دے وہ یار ملے
غم شناسانہ جاں نثار ملے
یوں تو ملنے کو یاں ہزار ملے

صادقہ نواب کی شاعری میں محبت اور امید ٹوٹنے پر کہیں نہ کہیں شکایت کا عنصر بھی نظر آتا ہے۔ جہاں امیدیں ٹوٹنے کے بعد دل کے درد باہر نکلتے ہیں ؎

جستجو کی ہے بہت ہاتھ نہ آیا کچھ بھی
دل دیا جان بھی دی پھر بھی نہ پایا کچھ بھی
میں نے دل کھول کے رکھا ہے تمہارے آگے
تم نے لیکن مجھے اب تک نہ بتایا کچھ بھی

محبت ایک ایسا جذبہ ہیں جس کا ہر دل بھوکا ہے۔ جو بڑے سے بڑے زخم کو لمحوں میں ختم کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ایک عورت کا دل بالکل ایسا ہی ہے، جو ذرا سی محبت ملتے ہی ہر غم کو سل سے مٹا دیتا ہے۔ صادقہ نواب نے اپنی شاعری میں اس کیفیت کا اظہار بھی بڑے

فنکارانہ انداز میں کیا ہے، اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سنگ ترے جب چلتی ہوں تو سب کچھ اچھا لگتا ہے
اتنا بتادے مجھ کو دلبر تجھ کو کیسا لگتا ہے
تیرے رہنے تک ہی دل میں خوشیوں کا تھا شور بہت
تجھ بن میر دل کا آنگن سونا سونا لگتا ہے

صادقہ نواب نے غزلوں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔ان کی ان نظموں میں بھی نسائی حسیت کا غلبہ ہے۔ان کی نظم ''عوض'' ملاحظہ فرمائیں، جس میں ایک عورت کے بے شمار احساسات و جذبات، کیفیات، امنگوں، آرزوؤں اور خواہشات کے ساتھ اس کی امیدیں اور اس کے دلی جذبات کو یکجا کر دیا گیا ہیں۔

بس میری یہ ہی تمنّا / اپنے دل میں/ شاعری کا دکھ درد رکھ کر/ میں پجارن گیت گاؤں / اپنے ہونٹوں پر سجا کر تیرے گیت/ اپنے اشکوں کی زبانی گنگناؤں/ ہاں، مگر ہونٹوں پہ میرے/ ہے اداسی/ میں ہوں پیاسی/ کیا محبت کو میں تج دوں/ تیاگ دوں اس پیار کو/ مجھ سے یہ ممکن نہیں/ درد کی چھایا میں پل کر/ میں کہاں جیون بتاؤں/ میں تو گاؤں گی خوشی کے گیت/ نغمے پیار کے/غم تمہارے بانٹ لوں گی/ پیار کے بدلے میں تم کو پیار دوں گی/ پیار پر میں زندگی کو وار دوں گی/غم تمہارے بانٹ لوں گی/ زخم پر رکھ دوں گی پھاہے/تم نے مجھ کو دیئے غم بے شمار/ میں عوض میں اس کے کو دوں گی پیار!

صادقہ نواب کی شاعری اپنے منفرد لب و لہجے کے سبب اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔وہ سوچتے ہوئے ذہن کے مقصدِ ابلاغ سے آشنا کراتی ہیں جس سے قدم قدم پر فکر و نظر کی شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں۔ دروں بینی سے کام لیتے ہوئے زندگی کی حقیقتوں اور عصری مسائل کو سمجھنے میں غور و فکر سے کام لیتی ہیں اور فکر و آگہی کی ہدایتیں نقطۂ نگاہ کو جامعیت عطا کرتی ہیں۔نازک بیانی کو سادہ طریقہ سے اپنی شاعری میں بیان کرتی ہیں۔اردو کے ساتھ ہندی الفاظ کے استعمال سے ان کی شاعری کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے اور یہ رنگ ان

کی تمام شاعری کا خاصہ ہیں پھر وہ نظم ہو یا غزل، انہوں نے بہترین الفاظ کو عمدہ ترتیب کے ساتھ اپنی شاعری کو ایک مالا میں اس طرح گوندھا ہے کہ قاری بنا رکے پڑھتا ہی چلا جاتا ہیں۔ ڈاکٹر صادقہ زبان صاف ستھری اور سہل استعمال کرتی ہیں۔ خیال، فکر، اور پیغام بالکل عیاں ہوتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے نثر کی طرح شاعری میں بھی اپنا علیحدہ مقام پیدا کیا۔ وہ عہد حاضر کی ممتاز شاعرہ ہیں جنھوں نے عورتوں کے درد و کرب کو اپنی نثر کی طرح شاعری میں بھی پیش کیا اور عورتوں کے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ بلاشبہ صادقہ نواب سحر ایک متحرک و فعال تخلیق کار ہیں جو دن رات ادب کی خدمت کے لیے سرگرم رعمل رہتی ہیں۔ امید ہیں وہ اسی طرح اپنی خدمات جاری و ساری رکھیں گی اور اپنی تخلیقات سے قاری کو مستفیض کرتی رہیں گی۔ میں اپنے مضمون کا اختتام علامہ اقبال کے ان اشعار سے کرنا چاہوں گی ۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں

اردو ادب کی ایک نئی سحر۔ صادقہ نواب سحرؔ

سیدہ ترنم بنتِ سید غنی
(گیان اُپاسک کالج، پربھنی، مہاراشٹر)

صادقہ نواب سحرؔ ادبی دنیا کی ایک مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں ہی ادبی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے حضرات کی تعداد کم ہے۔ اس میں بھی ان دونوں اصناف میں دستِ کمال حاصل کرنا اپنے آپ میں نایاب ہے۔ محترمہ سحرؔ صاحبہ کا شمار بھی انھیں نایاب اشخاص میں ہوتا ہے۔ نثری ادب میں محترمہ کے دو ناول پڑھنے کا موقعہ ملا۔ ''جس دن سے'' ور دوسرا ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' دونوں ہی ناول دورِ حاضر کے بہترین عکاس ہیں۔ ان دونوں ناولوں کے مرکزی کردار زندگی کے مسائل سے لڑنے والے آج کے دور کے نوجوانوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں مہاراشٹر کی تہذیب اور مہاراشٹر کی زبان و لہجہ جھلکتا ہے۔

میں نے محترمہ سحرؔ صاحبہ کی شعری اصناف میں ان کی آزاد نظمیں اور غزلوں کو پڑھا ہے، سحرؔ صاحبہ نے اپنے اطراف و اکناف میں موجود تقریباً ہر شئے کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے، مثلاً 'تتلی'، 'بچپن'، 'فصلیں'، 'جنگل'، 'مداری'، 'زلزلہ'، 'بابا'، 'اولاد'، 'بہن'، 'گدھے' اور 'بنجارن' وغیرہ یہاں تک کہ سحرؔ صاحبہ نے 'حلالہ' اور 'آتنک وادی' جیسے حساس موضوع پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ غرض یہ کہ روزمرہ کی زندگی کا ہر موضوع ان کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ شاعر کی سوچ اور غور و فکر کی صلاحیت عام انسان کی سوچ اور صلاحیت سے بہت مختلف ہوتی ہے، جہاں عام انسان کو پھول میں پنکھڑیاں اور رنگ نظر آتے ہیں، وہیں ایک شاعر کو اس میں خدا کی قدرت کا جلوہ اور اپنے محبوب کا چہرہ نظر آتا ہے۔ سحرؔ صاحبہ نے بھی زندگی کی ہر

عام سی شئے کو شاعر کی نظر سے دیکھا اور انھیں اپنی نظموں میں پرویا۔

نظموں کے علاوہ سحؔر صاحبہ کی غزلیں بھی بہترین اور موثر ہے۔ان کی زیادہ تر غزلیں مشرقی خاتون کے احساسات اور جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ پڑھنے والوں کو ان کی غزلیں اپنے دل کا حال محسوس ہوتی ہیں۔سحؔر صاحبہ کی غزلوں کی ایک خاصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے بے جا استعارے، مشکل وثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی غزلوں میں سادگی اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ بامعنی صاف اور سادہ الفاظ کے استعمال نے غزل کو پر لطف بنا دیا ہے۔

سحؔر صاحبہ کی تمام ہی غزلیں معیاری ہیں جیسا کہ وہ اپنے غزل کے شعر میں فرماتی ہیں ؂

چیز معیاری ہو یہ ہے آرزو
میں کہاں گھبرا رہی ہوں دام سے

اسی غزل کے دوسرے شعر میں سحؔر صاحبہ اللہ تعالیٰ سے یوں دعا گو ہیں ؂

ایسا فن مجھ کو عطا کرائے خدا
لوگ خوش ہو جائیں میرے کام سے

سحؔر صاحبہ کے دونوں اصناف کی شہرت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کر لی، سحؔر صاحبہ کا کلام واقعی لوگوں کو خوشی کا احساس دلاتا ہے۔ بے شک خدا ایسا فن کسی کسی کو ہی عطا کرتا ہے۔

سحؔر صاحبہ کی غزلوں کے چند ایک اشعار تو بہت ہی عمدہ خیال اور گہرے معنی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ایک دو اشعار درج ذیل ہیں ؂

دہکتے شعلے جہاں جسم کو جلاتے ہیں
جنوں پسند وہاں بھی سکون پاتے ہیں

جنون چاہے کسی مقصد کا ہو، کامیابی حاصل کرنے کا یا پھر عشق کا، جنون پسند انسان اس راہ کی ہر مشکل ہر ٹھوکر میں لطف وسکون کا احساس پاتا ہے۔

ہر ایک بات میں مطلب کا دخل ہوتا ہے
کسی کے کون یہاں غم گسار ہوتے ہیں

بہت ہی گہری بات کہی ہے شاعرہ نے یہاں، کیونکہ دورِ حاضر میں انسان مطلب پرست اور خودغرض ہوگیا ہے۔لوگ تعلقات اپنے مطلب کی بنیادوں پر بنارہے ہیں، اس کڑوی سچائی کو سحرؔ صاحبہ نے دومصرعوں میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

آنسوؤں کے ساتھ دل کا غم بہہ جاتا ہے اس لیے کہا جاتا ہے رونے والے کو روکنا نہیں چاہیے، اسی بات کو سحرؔ صاحبہ نے اپنی ایک غزل کے شعر میں یوں عرض کیا ہے ؎

رونے والے کو نہ روکو تم اسے رونے دو
بوجھ اتر جاتا ہے اشکوں کے نکل جانے سے

درج ذیل غزل سحرؔ صاحبہ کی سادگی پسند طبیعت اور اخلاص کا پتہ دیتی ہے ؎

یہ کیسے کہہ دوں تجھ سے گناہگار میں نہیں
ایک آدمی ہوں بس کوئی اوتار میں نہیں

جتنا برا سلوک کیا تو نے میرے ساتھ
اتنے برے سلوک کی حقدار میں نہیں

یہ اور بات ہے کہ سزا تو نے دی مجھے
لیکن تجھے یقین ہے خطاوار میں نہیں

جب اختلاف ہے تو بچھڑنا ہی ٹھیک ہے
تو جانتا ہے مجھ کو ریاکار میں نہیں

جو کچھ ہے دل میں لب پہ وہی آچکا سحر
ہوں سادگی پسند اداکار میں نہیں

یہ مکمل غزل دل کے سچے جذبات کا اظہار ہے۔اس غزل کے تمام ہی اشعار بہترین ہیں، خاص طور پر غزل کا مطلع اور مقطع گہرے معنی لیے ہوئے شاعرہ کی شخصیت کا

عکس پیش کرتے ہیں۔

سحؔر صاحبہ کی ایک اور غزل جو مجھے بہت پسند آئی، جس میں موجودہ دور کے رشتوں کے نشیب وفراز واضح ہوتے ہیں، یہ غزل گویا آج کے دور کے ہر انسان کے دلی جذبات ہیں۔

اوروں کے لیے ہم نے کئی خواب سجائے
اک خواب بھی کیوں اپنے لیے بن نہیں پائے
محسوس تو کرتی ہوں مگر کہہ نہیں سکتی
اپنے ہیں یہاں کون اور کون پرائے
اس حال میں بھی تجھ کو ترس کیوں نہیں آتا
بیٹھے ہیں تیری یاد میں دنیا کو بھلائے
لمحوں میں جنھیں وقت کی سازش نے گرایا
صدیوں میں جو رشتوں کے محل ہم نے بنائے
چبھتی ہے یہی بات سحؔر دل میں ہمیشہ
کیوں اپنے مقدر میں نہیں پیار کے سائے

سحؔر صاحبہ کی شاعری کی ایک خاصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں میں یاسیت، اداسی یا دنیا سے ماورا گہرے غم والم، ہجر اور وصال کی وارداتیں نہیں بلکہ عام انسان کے احساسات، جذبات، چھوٹے چھوٹے پل اور خوشیاں وغم پیش کیے گئے ہیں، اس لیے بھی سحؔر صاحبہ کی شاعری ہر کسی کو اپنی سی لگتی ہے۔

بہر حال سحؔر صاحبہ کے اصناف کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ادب کے تشنہ افراد کے لیے سحؔر صاحبہ کا قلم ایسا چشمہ ہے جو نثری اور شعری دونوں اصناف کی تشنگی کو سیراب کرسکتا ہے۔ امید اور دعا ہے کہ محترمہ سحؔر صاحبہ اسی طرح اپنے قلم سے اردو ادب کے سرمائے میں اضافہ کرتی رہیں گی۔

☆☆☆

صادقہ نواب سحرؔ کی نظموں میں ماں کا تصور

ڈاکٹر جاں نثار معین
(ریسرچ اسکالر، شعبۂ تعلیم نسواں
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔ حیدرآباد)

صادقہ نواب سحرؔ بئ لنگول ادیبہ ہیں۔ اردو اور ہندی فکشن کی نوخیز تخلیق کارہ کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ ان کے فکشن کے علاوہ دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ آندھرا پردیش سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں سچائی اور حقائق کا حسن صاف نظر آتا ہے۔ ان تحریروں میں نہ تو گہری ادبی زبان ہے، نہ ہی دہلوی یا لکھنوی محاوروں کی بھرمار ہے اور نہ ہی اردو کے نامور ادیبات یا ادبا کی طرح معرب ومفرس الفاظ کا سہارا لیتی ہیں بلکہ ان کی تخلیقی نثر ہو یا شاعری دونوں میں حقیقت نگاری صاف نظر آتی ہے۔ وہ ترسیلی زبان سے عام انسان کے ذہن کی آبیاری کرتی ہیں۔ اس کا بہترین ثبوت ان کی شاعری ہے، جس میں انھوں نے ہندوستانی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کی شاعری میں متعدد مسائل کی عکاسی ملتی ہے، اسی لیے ان کی تخلیقات پر کافی لکھا جاچکا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے لیکن ان کی شاعری میں طبقۂ نسواں کی جس طرح نمائندگی ہوئی ہے، اس پر ابھی تک ہماری معلومات کے مطابق کسی نے ٹھوس تحقیقی یا تنقیدی کام نہیں کیا ہے۔ ابھی تک ان کی تحریروں میں طبقۂ نسواں یا ماں کی قربانیوں پر کوئی مقالہ، کتاب یا مضمون منظرِ عام پر نہیں آیا، اسی لیے میں نے ان کی شاعری میں ماں کے تصور پر مقالہ قلم بند کیا ہے۔ چونکہ دنیا بھر میں ماں کا ایک دن منانے کی روایت ہے۔ اسی طرح کی لچھے دار باتیں فکریں اور تاثرات پیش کر کے یہ سمجھ

لیتے ہیں کہ ماں کا حق ادا کر دیا لیکن صادقہ نواب سحؔر نے روایت سے ہٹ کر نظموں کے ذریعے ماں سے محبت اور اس کے حقوق کی ادائیگی پر قاری کی توجہ مرکوز کی ہے۔ ماں کی ممتا اور اس کی اہمیت پر زیادہ تر کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں لیکن آپ نے ماں پر نظمیں لکھی ہیں۔ مقالہ بیانیہ انداز میں بنیادی ماخذ پر مبنی ہے۔ جسے feminism Liberal کے نظریہ پر مکمل کیا ہے۔ اس تحقیق سے صادقہ نواب سحر کے یہاں ہندوستانی ماں کا تصور اور ممتا کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ چونکہ انہوں نے باقاعدہ اپنی نظموں کے عنوانات کو 'ماں اور میں'، 'آخر کو تو میں بھی ماں ہوں'، 'وہ ماں کہاں ......!'، 'ماں ہی نہیں ہے'، 'میرے بچے' اور لوریوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس اعتبار سے اس تحقیق کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

کلیدی الفاظ: تصورِ ماں، ممتا، اولاد

جب سے دنیا کا آغاز ہوا ہے، تب سے اپنے جسم کی ساخت اور سماج میں اپنی جگہ بنانے کے لئے عورت کو جدو جہد کرنی ہی پڑی ہے۔ یہ جدو جہد کئی پیمانوں پر ہوتی رہی ہے۔ انسانی ضرورتوں نے بہت بار عورت کو حدود میں باندھا ہوگا لیکن ہر دور میں اس نے یا اس کی ہم جنسوں نے کسی نہ کسی طرح یہ حدود پھلانگنے کی کوشش ضرور کی ہوگی۔ اس کام میں بہت بار مردوں نے اس کا ساتھ دیا ہوگا وجود کی لڑائی میں سماج مرد اساس بنا اور عورت اکثر بھلا دی گئی۔ پیدائش سے ہی نوزائیدہ لڑکے کو بھی بڑی اہمیت ملی۔ اسے کمانے والا، گھر بسانے والا اور محنت کرنے والا کہا گیا، اس لئے سوسائٹی میں تعلیم، صحت اور انصاف کے معاملے میں عورت کو دوسرے درجے کے شہری جیسا درجہ ملا ...... عورت کو کمزور کہا گیا جبکہ وہ کئی جگہوں پر ذہنی، جسمانی اور معاشی طور پر مردوں سے مضبوط ثابت ہوئی ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ عورت کو کم عقل اور کمزور مانا جائے! جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، قدرت سب پر برابر مہربان ہے، وہ سب کے جذبات کو یکساں تحریک دیتی ہے۔ یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں، ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ صنفِ نازک کا ذکر آتے ہی عورت جس رنگ وروپ اور ڈھنگ

کا تصور بن کر ابھرتی ہے، ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی۔ کتنے ہی جسمانی طور پر یا قوتِ ارادی اور خود اعتمادی میں نازک اور کمزور مرد بھی ملتے ہیں، جو ذرا سے دھکے سے دھول میں مل جائیں! سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بھی لڑکی لڑکے سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ عورت نے روایت کی ڈور کو پکڑے رکھا ہے۔ وہ سماج اور خاندان سے جڑی رہنا چاہتی ہے۔

صادقہ نواب سحرؔ

1-تمہید

صادقہ نواب سحرؔ کی نظموں میں ماں کا تصور خصوصیت کے ساتھ شامل ہے۔انہوں نے باقاعدہ اپنی نظموں کے عنوانات ہی ماں دیے ہیں۔ چونکہ انسانی رشتوں میں سب سے بڑھ کر اہم رشتہ ماں کا ہے۔ وہی اس کے دنیا میں لانے کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ وہی اولاد کی داشت اور تربیت کرتی ہیں، اسی لیے ماں کی گود کو ہی اولین مدرسہ کہا گیا ہے۔اس کا ثبوت آپ کی نظموں میں کو بہ کو ملتا ہے۔ان کی نظم ''جنگلی'' کے یہ بول ''ماں ہوں، ماں ہی رہوں گی تجھے خیال نہیں'' آپ نے اس یقین کو نظموں کی روشنی میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس مضمون میں ہم نے آپ مبہم سوالات پر خصوصی توجہ دی ہے۔آپ نے نظموں میں کچھ اس طرح کے سوالات قائم کیے ہیں۔ کیا عورت ہی اولاد کی مکمل ذمہ دار ہوتی ہے؟ کیا وہ لڑکی کو جنم دے کر کوئی گناہ کرتی ہے؟ کیا ماں کی نظر میں لڑکا اور لڑکی میں فرق پایا جاتا ہے؟ کیوں ماں کو دوہری ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے؟ ان سوالات کے جوابات ہم نے ان کی نظموں میں تلاش کرلیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کا تصورِ ماں بہت مضبوط ہے۔ اس میں بے انتہا کی پاکیزگی ہے اور جذبات میں ایک سمندر چھپا ہوا ہے، اسی لیے اس عنوان پر مضمون لکھنا ضروری تھا۔اس تحقیق سے آپ کے فہم وادراک کا علم ہوتا ہے۔ ویسے تو آپ نے متنوع جہات موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ہم نے ماں کے تصور پر مقالہ مکمل کیا ہے۔

2-تعارف

ماں ایک روشن مینار کی طرح ہوتی ہے،جس میں پیار و ممتا کی بے پناہ مٹھاس، ایثار و قربانی کا انمول احساس ہوتا ہے۔ اس میں دل چسپی و دل بستگی کا ہر سامان پوری فراوانی کے ساتھ اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر طاقت وقوت، ہر چاہت و الفت اس کے آگے ہیچ سی معلوم ہوتی ہے۔ماں ایک عظیم نعمت ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ماں کائنات میں انسانیت کی سب سے قیمتی متاع اور عظیم سرمایہ ہے کیونکہ وہ اولاد کی ہر تکلیفیں برداشت کرتی ہے اور ان کے سکون کی خاطر اپنی جاں نثار کرتی ہے۔ان کی پرورش کر کے اس قابل بناتی ہے کہ وہ معاشرے کا اہم حصہ بن سکیں۔ماں بچوں کی ایک ہائے پر تڑپ اٹھتی ہے اور صفائی ستھرائی کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑتی۔ وہ بچے کی ہر ضرورت کو جانتی ہے، اسی لیے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔اس طرح کی تمام قربانیوں کے بدلے میں دنیا بھر میں ماؤں کا ایک دن منایا جاتا ہے جبکہ اس عظیم مرتبہ کی شخصیت کا تو ہر وقت احترام ہونا چاہیے۔

3-تصورِ ماں

ماں سے متعلق لکھنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے، ایک ایسا سمندر جس کی گہرائیوں کا اندازہ بھی کرنا انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ ہر رشتے کو الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے لیکن ماں کی محبت کا لفظوں میں بیان بہت مشکل ہے، اسی لیے صادقہ نواب سحؔر نے اپنی نظموں میں ماں کی محبت کے کچھ ثبوت اس طرح دیے ہیں۔ان کی ایک نظم ''ماں اور میں'' میں ماں اپنے بچے کو وہ دن یاد دلاتی ہے کہ جب وہ چھوٹا سا تھا تو اسے سکون کی نیند آتی تھی۔ اس وقت تمھیں کوئی درد نہیں ہوتا تھا۔اس طرح مختصر الفاظ میں آپ نے ماں کی ممتا اور اولاد کا اس کے ساتھ احساس کا گہرا عکس کھینچا ہے۔ثبوت میں نظم ''ماں اور میں'' ملاحظہ ہوں:

یاد ہے تم کو/ نیند تمھیں کتنی بھاتی تھی/ نیند میں تم دنیا کے درد بھلا دیتی تھیں/ نیند میں

اک دن تم دنیا سے چلی گئیں/ صبح کو اگلے دن میں نے/ اپنی آنکھوں کو جھانکا/ تم مجھ کو اپنی آنکھوں میں آئیں نظر/ جیسے تم میری آنکھوں میں جذب ہوئیں/ جیسے میری ہستی/ میری سانسوں میں/ تم گھل سی گئیں ......!

اس نظم کی روح میں ماں اور اس کی ممتا دونوں چھپی ہوئی ہے۔ ابتدا میں ماں اپنے بچے کو وہ دن یاد دلا رہی ہے کہ تم کو زندگی کے کسی قسم کے غم نہیں تھے جب تم میری گود میں سویا کرتے تھے۔ جب تم میرے حصار میں میٹھی نیند سویا کرتے تھے۔ دوسری فکر اولاد کی ہے۔ بچہ جب حالات سے تنگ آتا ہے تو اسے سب سے عزیز ماں ہی لگتی ہے۔ اس کی ممتا اور اس کے بدن کی گرمی سے دنیا بھر کی تھکن، پریشانی اور غم بھولا دیتی ہیں، اسی لیے دوسرے مصرعوں میں بیٹا ماں سے کہہ رہا ہے کہ ''ماں'' جیسے میری ہستی میری سانسوں میں بس گئی ہو۔

شاعرہ نے ایک ایسی ماں کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے گاؤں کی سچی، مکمل ممتا کی دیوی ہو۔ نظم میں کئی علامتیں چھپی ہیں۔ ماں استعارہ کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ نظم کے ابتدائی جملوں سے ہی نظم کا خلاصہ ہو جاتا ہے کہ وہ ماں کہاں ہے جو کھیت، کھلیان اور ہندوستانی تہذیب کی مورت جو اپنے بچوں کی خاطر جیتی اور مرتی ہے لیکن افسوس اب نہ کوئی ایسی ماں ملتی ہے نہ ہی اس کی ممتا۔ ماں کے وہ رشتے بھی نہیں ہیں جن سے میرا وجود ہے۔ ثبوت میں 'آخر کو تو میں بھی ماں ہوں' نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہوں:

وہ ماں کہاں ......!، کون ہے اس دنیا میں، ماریشس سے لوٹ کر، ماں ہی نہیں ہے، اپنے محسن سے، وراثت، بہن، تم سے۔ اسماء، اولاد، بابا، بہنا، نغمہ، میرے بچے۔

عالم کاری کے مضر اثرات ہندوستانی معاشرہ پر اس طرح مرتب کیے ہیں کہ ماں کو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ چونکہ ماں، جنت کو پانے کا ایک آسان راستہ ہے، اسی لیے ماں ہی ہے جس کا احساس مرتے دم تک ہوتا ہے۔ ماں ایک پھول ہے جس کی خوشبو ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ وہ بے وفا نہیں ہوتی۔ وہ ایک ایسا وعدہ جو کبھی ٹوٹتا نہیں۔ وہ ایک ایسا خواب ہے جو ایک تعبیر بن کر ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ وہ ایک ایسی محبت جو کبھی کم نہیں ہوتی،

بلکہ وقت کے ساتھ یہ اور بڑھتی رہتی ہے۔ وہ ایک ایسی پرچھائی ہے جو ہر مصیبت سے اولاد کو بچانے کی کوشش میں رہتی ہے۔ ماں ایک ایسی محافظ ہوتی ہے جو ٹھوکروں سے بچاتی ہے۔ مصنفہ مزید سوالیہ نشان لگاتی ہیں 'وہ ماں کہاں ہے؟'':

وہ ماں کہاں چلی گئی/ کہ جس کے دم سے زندگی/ حسین تھی، یقین تھی، دلوں کا اعتبار تھی/ وہ دھڑکنوں کا ساز تھی، مری متاعِ ناز تھی/ دعا میں وہ مرے لئے۔ خدا سے خواستگار تھی/ تھکان سی لگی مجھے، کہ پیاس سی جگی مجھے/ فضا میں ڈھونڈتی رہی محبتوں کی بارشیں/ خمار ٹوٹ سا گیا، غبار پھوٹ گیا/ وہ ماں نہیں ملی مجھے/ دلوں پہ اختیار تھی/ (جو میرا اعتبار تھی) / بچا سکوں گی میں انہیں، نہیں کئی امانتیں/ تو ہی تو سونپ کر گئی عدم کی شاہراہ پر/ یقین ہے گماں نہیں، کہ تیری بزم ہے سجی/ جہاں ہے تو، ہے روشنی/ یہاں بھی تو بہار تھی/ ذرا تو دل کو تھام لے۔

اس نظم میں ماں کی نعمت پر بہترین انداز میں اعتراف کیا گیا ہے کیونکہ دنیا میں عطا کی گئی اللہ کی سب بڑی نعمت ماں ہے، جس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ماں ہی انسان کے وجود کا ذریعہ ہے۔ وہی پالتی ہے۔ وہی اس قابل بناتی ہے کہ ہم سر اُٹھا کر جی سکیں۔ ماں ہی بچے کے درد کو اپنا بناتی ہے۔ جب بھی اولاد کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بے چین ہو جاتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کا ہر وقت انتظار کرتی ہے۔ مصنفہ نے اس بات پر توجہ دلائی ہے کہ ایسی عظیم شخصیت کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اگر اس سائے سے محروم ہو جائیں تو معلوم ہوگا۔ ماں کی محرومی کا اعتراف ایک نظم ''ماں ہی نہیں ہے'' میں کچھ اس طرح کیا ہے:

ماں کا چشمہ ماں کی کتابیں/ وہیں پڑی ہیں/ ماں ہی نہیں ہے/ کمرے میں ماں کی خوشبو/ ویسے ہی بسی ہے/ بستر کی بے چین سلوٹیں/ پوچھ رہی ہیں/ بکسے کی رنگین دوائیں/ یوں ہی پڑی ہیں/ ماں کی چوڑی/ ماں کے کنگن/ ماں کے جیون کی ہر الجھن/ وہیں دھری ہے/ ماں ہی نہیں!

جب ماں کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں تو اس کی ہر چیز میں اس کی یاد آتی ہے۔ چونکہ وہ اپنی ممتا سے ہماری زندگی کو سجاتی ہے۔ ہمیں اپنے نور سے منور کرتی ہے۔ وہ سائے کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔ وہ بری نظر سے بچائے رکھتی ہے، اسی لیے اس کی یاد دل کی

گہرائیوں میں بس جاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز کو بھلایا جا سکتا ہے لیکن کبھی ماں کی یاد دل سے نہیں مٹائی جاسکتی۔ جب ماں ہی نہیں رہی تو انسان کے لیے زندگی ہیچ ہو جاتی ہے، چونکہ ماں اپنے بچوں کے لیے جیتی اور مرتی ہے۔اس کا مقصد ہی اولاد کی ترقی وترویج ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مصنفہ نے ایک نظم ''میرے بچے'' لکھی ہیں، جس میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اولاد ایک ماں کے لیے کتنی اہم ہوتی ہیں:

مجھے بھی پتہ ہے/ کہ تھوڑا سا گر وقت دوں میں اِنہیں/ یہ سنور جائیں/ ایسے نکھر جائیں۔/ جیسے/ کوئی پھول/ قدرت کا جیسے کرشمہ/ مگر مجھ کو فرصت کہاں/ مہلت کہاں/ کہ اِن کو سنواروں/ میں اِن کو نکھاروں/ سنواروں میں ہر لٹ/ نکھاروں غزل کو/ کہ نظموں کو دلہن بناؤں/ کہ معنی سے، لفظوں سے بڑھ کر ہیں/ مجھ کو یہ بچے مرے/ کھلکھلاتے ہوئے/ یہ جو گودی میں میرے/ بڑے ہو رہے ہیں/ کہ یہ فرض بھی، اک بڑا فرض ہے/ مگر وہ جگہ فرض یکساں بڑے ہیں/ میں اِن کو سنواروں کہ اُن کو سنواروں/ بہت وقت کم ہے۔

شاعرہ نے اس پر زور دیا ہے کہ ماں کی محبت و ممتا اپنے آپ میں ایک مثال ہوتی ہے۔ ماں کی محبت وہ گہرا سمندر ہے، جس کی گہرائی کو آج تک کوئی ناپ نہ سکا۔ ماں ہمالیہ ہے جس کی بلندیوں کو کوئی آج تک چھو نہ سکا۔ ماں تو اولاد پر قربان ہو جایا کرتی ہے۔ ماں انسانوں کی ہو یا جانوروں یا پرندوں کی اس میں ممتا اور قربانی کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ پیاس کی حالت میں بھی اولاد کی پیاس کی فکر کرتی ہے۔ ماں ہر اعتبار سے اولاد کے لیے کسی رحمت یا نعمت سے کم نہیں ہوتی۔ وہ ہر وقت اولاد سے متعلق سوچتی ہے۔ ان کی ترقی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔اس کا بہترین ثبوت ان کی ایک نظم ''لبنیٰ'' (اپنی بیٹی کے نام) میں ماں کی ممتا اور اس کے حسین جذبات کی بہترین عکاسی کی ہے:

پیاری پیاری کلی/ کیسی مجھ کو ملی/ واری واری ہوئی جارہی ہوں/ گیت ایسے میں، میں گا رہی ہوں/ سونا سونا جہاں ہوگا، جب جاؤ گی/ دِل کا رشتہ بڑا ہے رسیلہ/ تجھ کو موسم ملے ہر رنگیلا/ سب کی آنکھوں کا نور/ نا رہو دور دور/ سینے سے میرے لگ کر رہونا/ تم ہی دل کا مرے چین ہونا/

بھائی کا پیار ہو/ میرا اسنسار ہو/ میری عزت، مرا پیار ہو تم/ میری خوشیوں کا سنسار ہو تم

جب عورت ماں بنتی ہے تو وہ اپنی زندگی کی نئی شروعات کرتی ہے۔ حالانکہ ماں بنتے ہی اس کو جسمانی اور صحت کی تکالیف برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کی ہڈیاں کمزور ہونے لگتی ہیں۔ نیند کم ہو جاتی ہے۔ وہ بچی کی ایک آہٹ پر اس کا خیال رکھتی ہے۔ رات رات بھر جاگنے سے کمزور ہوتی رہتی ہے، پھر بھی وہ تمام قربانیوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ بچی کی داشت کو وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس کی ہر ہر حرکت پر خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ مسکراہٹ پر زندگی کی تمام خوشیاں نثار کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ بچی کھیلتی ہے تو اس کے ساتھ جاگتی ہے۔ جب وہ سونے لگتی ہے تو اس کے لیے سہانی آواز میں لوری سناتی ہے، جس کا ایک ثبوت ان کی نظم 'لوری' ہے، جس میں انھوں نے لوری سے بچیوں کو سکون کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے، اس کی مثال پیش کی ہے:

(لوری) سونے کے پلنے میں تجھ کو سُلاؤں/ ہیرے کی جھالر سے اُس کو سجاؤں/ موتی کی لڑیوں کی جھالر بناؤں/ چاندی کی ڈوری سے تجھ کو جھلاؤں/ ننھی سی پلکوں میں نندیا بُلاؤں/ سو جا ری لاڈو میں لوری سُناؤں/ سو جا کہ چندا بُلائے تجھے/ پیارے کھلونے کھلائے تجھے/ نیندوں کی گاڑی لے جائے تجھے/ خوابوں کی نگری دکھائے تجھے/ بگیا میں کلیاں اور پتّے بھی سوئے/ مینا بھی سوئی اور طوطے بھی سوئے/ بلّی بھی سوئی اور چیتے بھی سوئے/ کھیلے گی کودے گی جاگے گی جب/ گر بھی پڑے گی تو بھاگے گی جب/ آنکھوں میں آنسو بھی آئیں گے تب/ امی کی بانہوں میں آئے گی جب

مصنفہ نے اس پر زور دیا ہے کہ ماں کی لوری کے پہلے بول اور کان میں پڑنے والی پہلی آواز ماں بولی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ماں کے منہ سے بولے گئے چند بول ایک بچے کی سب سے پہلی یاد ہوتے ہیں۔ ماں کی زبان خود بخود بچے کی زبان بننے لگتی ہے۔ یہ ننھا بچہ ابتدائی عمر کی منزلی طے کرتا ہوا جیسے ہی سکول کے دروازے تک پہنچتا ہے، اس کے سامنے زبان و بیان کی ایک نئی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اب ماں بولی کے میٹھے بول ہر

گزرتے دن کے ساتھ لاشعور کی تہوں میں بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں اور شعور کی دنیا کے شور میں اس کے کان اپنی ماں کی آواز نہیں سن سکتے، جبکہ ماں کی لوری کے اثرات اس قدر رہوتے ہیں کہ انسان کچھ بھی کر لے ماں کی بولی اور چاشنی کو بھلا نہیں سکتا۔ ماں کی بولی کا مخصوص لہجہ اور تلفظ ہی انسان کو سب سے زیادہ پسند آتا ہے، اسی لیے صادقہ نواب سحر نے ایک اور نظم ''سوجا میرے راجکمار'' (لوری) میں بھی بیٹا اور بیٹی دونوں میں یکساں محبت کا پیغام دیا ہے۔ وہ بیٹے کولوری دے کر اپنے منّے کو کہہ رہی ہیں کہ سوجا آپا بھی سوئی ہے:

سوجا میرے راجکمار/ تجھ کو دعائیں دوں سوبار/ دیکھ تو آپا سوئی ہیں/ نندیا میں وہ کھوئی ہیں/ نندیارانی آتی ہے۔ دیکھ تجھے بھی بُلاتی ہے۔ دیکھ ہوا بھی سُلاتی ہے۔ پاس تجھے بھی بُلاتی ہے۔

اس نظم میں آپ نے ایسی ماں کی ممتا کی تصویر کھینچی ہے کہ جس نے ماں کو نہیں دیکھا، اسے بھی ماں لفظ سے محبت ہو جائے گی۔ اس نظم میں ماں کی پاکیزہ محبت اور ہمدردی کو چند مصرعوں میں بیان کر کے ایک ماں ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے مصنفہ نے اپنے جذبات کو نظم میں بیان کر دیا ہے۔ جہاں انہوں نے لوری دے کر بچوں کو سلانے کا ہنر پیش کیا، وہیں بیٹی کی تلاش میں بھی اپنے فلسفیانہ انداز میں بیٹیوں سے محبت کا پیغام اپنی نظم ''گڑیا کہاں گئی'' میں کچھ اس طرح دیا ہے:

بہت زمانہ گزرا میں نے اُس کو نہ دیکھا/ ہاتھ میں رسّی، جھوم جھوم کر کودرہی تھی/ لہک لہک کر گیت سناتی، گیت بناتی/ پریوں کی، راجہ رانی کی کتھا سناتی، کتھا بناتی/ اور ذرا سی فرمائش پر/ تھرک تھرک کر ناچ دکھاتی/ لاڈ لاڈ میں، پیار پیار میں/ کھل کھل جاتی، ہل مل جاتی/ ممی بابا کا جوٹھا پانی/ وہ چپکے سے پی جاتی/ سارے علاقے میں گڑیا سی/ چہک لگاتی، گشت لگاتی/ سب کے لاڈ کے بیچ پلی وہ ننھی گڑیا/ کہاں کھوگئی/ بہت زمانہ بیتا میں نے اس کو نہ دیکھا۔

اس نظم میں بھی وہ اپنی بچی کی یاد کو تازہ کر رہی ہیں۔ اس کے ننھے ننھے پاؤں سے چل کر آنا، پریوں کی کہانیاں سنتے سنتے سو جانا اور چھوٹی چھوٹی فرمائشیں کرنا۔ جھوم جھوم کر جلوے دکھانا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں زور سے ہنس دینا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے کھلانا۔

کبھی جھولے میں تو کبھی گودی میں جھوم کر فرمائش کرتی تھیں۔ صادقہ نواب سحر نے ماں کی ان یادوں کو پیش کیا جو ہر ماں دیکھتی ہیں۔ اس نظم میں آپ نے بیٹیوں کی جدائی کا دلکش منظر کھینچا ہے، جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں اور بیٹیوں سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کا یہی کمالِ حسن ہے کہ عام فہم انداز میں دل کو چھو جاتی ہیں۔ آپ کی نظمیں پڑھتے وقت قاری بھی خود کو نظم کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ جہاں آپ نے ماں کا تصور دیاہ، وہیں اس کا تحمل بھی پیش کیا ہے۔ کس طرح عورت ماں بننے کے بعد ازدواجی مسائل سے گھر جاتی ہے۔ شوہر کی زیادتیوں کو بھی اپنی اولاد کے لیے برداشت کرتی رہتی ہیں۔ اسے ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں اس کی ازدواجی زندگی ختم نا ہو جائے، اسی لیے وہ مرد کے ہر حکم کو نبھاتی رہتی ہے۔ اس کا بہترین ثبوت ان کی نظم ''سلسلہ'' (ایک سہیلی کی نظر سے) ہے جس میں انہوں نے طلاق کی دھمکیاں اور عورت کے تحمل کی بہترین عکاسی کی ہے:

روز جسے ملتی ہو دھمکی تین طلاقوں کی/ پیار کی برساتوں میں بھیگے بھی تو وہ کیسے/ زندہ رہنے کا مطلب گر خوف میں جینا ہے/ سچ بتلاؤ ایسے جینے کا کیا مطلب ہے/ دھوپ چھاؤں کی لُکّا چھپّی اپنی قسمت کیوں؟/ جُڑ ہی نہ پائے اُس شیشے پر اتنی محنت کیوں؟/ دو دن کی دنیا میں کیسے کھیل دکھاتے ہیں/ بچوں کی قسمت کا بھی تو کھیل بناتے ہیں/تم کیا چھوڑو گے مجھ کو، میں چھوڑوں گی/ ارمانوں کے دیپ کو اپنے ہاتھوں میں لوں گی/ کتنی خدمت میں نے تمہارے گھر والوں کی/ اور تمہاری جھولی میں نے پھولوں سے بھر دی/ کل کی امیدوں میں/ میں نے آج گنوایا ہے/ آج نیا اس من میں لیکن گیان سمایا ہے/ ایک لفظ بھی بولی تو تم تین طلاقیں دو گے!/ بچوں کی خاطر پھر پچھتاوا بھی تو کر لو گے/ کس کے حوالے میرا نوالہ یا کہ حلالہ ہوگا؟/ بچوں کی خاطر مائیں کیوں لُٹتی ہیں سوچوں گی!/ آج تمہاری گود میں بچے رکھ کر میں دیکھوں گی۔ آزادی اور حق کا داؤ پل تم نے کھیلا/ آج مرا کمزور سلسلہ بھاگ مرا لکھ لے گا

اس نظم میں طلاق سے پیدا ہونے والے مسائل اور اس کے مضر اثرات بچوں پر کس طرح گرتے ہیں۔ اس کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ دوسری اہم بات اس نظم میں یہ بھی ہے کہ

بچوں کی بنا پر عورت برداشت کر کے ازدواجی زندگی کو محفوظ بھی کرتی ہے۔ جب مرد زیادتی پر آتا ہے تو بچوں کی محبت عورت پر غالب آجاتی ہے اور وہ برداشت کرتی ہے۔ ماں یہاں پر دوہرے استحصال کی شکار ہوتی ہے۔ ایک شوہر کے ظلم وزیادتی سے تو دوسری طرف اپنے بچوں کی محبت میں۔ اس طرح وہ زندگی کسمپرسی میں ہی گزار دیتی ہے۔ اس ضمن میں آپ کا ایک شعر:

میں عورت ہوں یہ فطرت میں ہے میری
میں اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں

اسی طرح انہوں نے ایک نظم ''اونچے گھر کی دلہن'' میں ادنیٰ ذات کی لڑکیوں کو جب اونچے گھرانوں میں شادی کر دی جاتی ہے تو وہ خوش تو ہو جاتی ہیں لیکن زندگی بھر پریشانیوں کا سامنا کرتی رہتی ہیں۔ اپنے شوہر اور بچوں کا خیال رکھنے کے باوجود ان کو اور ان کی اولاد کو ہمیشہ ان کی ذات بنا پر تذلیل کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ زندگی کی تلخیاں سہتی رہتی ہیں:

چھوٹی ذات کی چنچل لڑکی/ گونگے بہرے لڑکے سے/ شادی کرنے کو/ کیوں تیار ہوئی ہے؟/ وہ خوش ہے/ ایسی خوش کہ/ میں نے اِس سے پہلے/ کبھی نہیں دیکھا اُس کو اِتنا ہنستے/ اِتنا سنتوش/ کہاں تھا اُس کے چہرے پر اس سے پہلے۔/ کیا اُس کے من میں ہے؟/ جانے کیا اُس کے من میں/ روٹھی روٹھی قسمت تھی/ اب بھاگ جگے تھے/ دھن دولت جھولی پھیلائیں گے/ اب اُس کے آگے/ کیا دھن دولت نے/ یا چھوٹی ذات سے چُھٹنے کا/ یا چھوٹی ذات سے چُھٹنے کا/ موقعہ آیا ہے!/ جیون ساتھی سے جیون بھر/ بول نہ پائے گی/ لیکن اونچی ذات کی وہ دُلہن/ تو کہلائے گی۔

اس نظم میں جس طرح چھوٹی ذات کی دلہن کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس سے تو ماں کا تصور صاف نظر نہیں آتا لیکن ایسی خواتین جب ماں بنتی ہیں تو ان کے مسائل اور بڑھ جاتے ہیں۔ ایک اور ہندو عورت کی کہانی ''شکنتلا'' میں بیان کی گئی ہے۔ جب مرد عورت کے حسن یا اس کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کسی طرح ازدواجی رشتوں میں بندھ تو ہو جاتا ہے لیکن ذہنی طور پر وہ آزاد رہتا ہے۔ وہ جب چاہے اسے تنہا چھوڑ کر چلا جا سکتا ہے۔ جس کے سبب

شکنتلا جیسی عورتیں اپنی اولاد کو لے کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتی رہتی ہیں:

گُمان تھا کہ/ اک ایسا بھی وقت آئے گا/ بڑھا کے ہاتھ/ محبت کے پھول کی مالا/ گلے میں ڈال کے/ تم مجھ کو بھول جاؤ گے/ شکنتلا سی کھڑی راہ میں نہاروں گی/ رِوایتوں کی ڈگر پر چلو گے/ تم دُشینت!/ محل کے کام/ سلیقے سے تم نبھاؤ گے/ تمام فیصلے/ کرنے لگو گے/ مذہب سے/ مگر ذرا سا یہ سوچا کہ یہ بھی مذہب ہے/ دِیا تھا تم نے جسے نام/ مذہبِ دِل کا۔

اس نظم کا تعلق راست ماں سے نہیں ہے لیکن ایسی ہی خواتین ہوتی ہیں جن کے مسائل ماں بننے کے بعد بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی ممتا بھی مجبور ہو جاتی ہے کہ اولاد کے سکھ کی خاطر یا تو طرح طرح کے مسائل سے جوجھتی رہتی ہیں۔ یا پھر بے راہ روی کی شکار ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معاشرہ میں گمنامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ صنفی اعتبار سے مرد و زن میں مساوات ہونا چاہیے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے آپ ایک انٹرویو میں حقانی القاسمی سے کہتی ہیں:

> ''ہماری سوسائٹی میں ڈسکریمنیشن تو ہر جگہ ہے۔ یہاں تک کہ ماں باپ کی نظر میں بھی اکثر سارے بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آخر انسان جذبات سے بنا ہے۔ یہ ورجینڈر سسٹم تو شاید کبھی ختم ہی نہیں ہوں گے۔ عورت مرد نا برابری ہی نہیں، ہر جگہ جانبداری اور غیر مساوات پھیلی ہوئی ہے اور یہی تو چیلنج ہے۔''

4- ماحصل

صادقہ نواب سحر کی نظموں میں تصورِ ماں کے احساسات، ممتا، پاکیزگی اور اس کی قربانیوں کی بہترین تصویر کھینچی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی ماں کا تصور صاف نظر آتا ہے اور عام فہم الفاظ میں گہری بات ہوتی ہے۔ ان کی شاعری فکری اعتبار سے بھی منفرد ہے۔ جس طرح سے انہوں نے خالص ماں اور اس کی نفسیاتی کشمکش کا طائرانہ جائزہ لیا ہے، وہ اپنے آپ میں مشکل کام تھا۔ آپ نے نا صرف ایک ماں کی قربانیوں کا جائزہ لیا بلکہ اولاد کی پرورش اور ان کے حسین جذبات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ کس طرح ایک ماں اپنی اولاد

کی خاطر قربانیاں دیتی ہے، اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔آپ نے صرف ہندوستانی ماں کا تصور پیش کیا ہے۔ اس کے لیے وہی بولی کا استعمال کیا ہے جو ایک ماں کے دل سے نکلتے ہیں۔ ان کی ماں کی قربانیوں کو پڑھنے سے قاری کو اپنی ماں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کس طرح اندھیری راتوں میں مائیں لوریاں گا گا کے بچوں کو سلاتی ہیں اور وہ کس طرح لذیذ اور صحت مند غذا کھلاتی ہیں۔ اس کی وہ تمام قربانیوں کا عکس مختصر الفاظ میں بیان کر کے آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موٹی موٹی کتابیں لکھنے کے بجائے اختصار سے چند الفاظ میں ہی ماں کا تصور دیا جا سکتا ہے۔

5- مفروضے

صادقہ نواب سحر کی نظموں میں ہندوستانی دیہی ماں کا تصور ہے۔ جو اپنی اولاد کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ وہ وقت آنے پر اپنے حق کو دبا کر بچوں کے حقوق ادا کرنے کا جذبہ رکھتی ہے۔ ماں کے کردار میں مصنفہ کی خود آپ بیتی ہے۔ جس سچائی سے ماں کی ممتا کی پیش کشی ہوئی ہے وہ روایتی نہیں ہو سکتی۔ کبھی وہ اولاد کی داشت پر زور دیتی ہے تو کبھی ان کے سکون کے لیے لوریاں گاتی ہے۔ ہر طرح سے بچوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ منجملہ آپ کا تصور ماں کا احساس نہ صرف اچھوتا بلکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے جڑا بھی ہے، جس کی وجہ سے خالص ہندوستانی ماں کا تصور صاف ظاہر ہوتا ہے۔

6- مقاصد

صادقہ نواب سحر کی نظموں میں ماں کی تلاش کرنا اور اس کی ممتا کی نشاندہی کرنا۔ وہ کس طرح روایتی ماں سے الگ ہے، اس کی وضاحت کرنا۔ تاکہ ان کی نمائندہ ماں پر لکھی ہوئی نظموں میں تصور ماں اور اس کی نفسیاتی کشمکش کا تنقیدی جائزہ لینا۔ انہوں نے کس طرح سے عام فہم عورت میں خصوصی کردار نگاری کو پیش کیا ہے، اس کا تانیثی نقطہ نظر سے جائزہ لینا۔

7-تجاویز

صادقہ نواب سحر کی نظموں میں ماں کا تصور ہے۔ جولطیف جذبات کی مالک ہے۔ جس کی ممتا میں پاکیزگی ہے۔وہ اپنے حقوق پر اولاد کو ترجیح دیتی ہیں۔وہ بچوں کے لیے جذباتی ہے۔وہ ہر حالات کا سامنا کرتی ہیں۔ ماں ہوتے ہوئے وہ باپ اور طبیب کی ذمہ داریاں بھی نبھاتی ہیں۔وہ شوہر سے تو سخت کلامی کرتی ہے اولاد کے حقوق کی خاطر لیکن ان کی نیند کے لیے میٹھی آواز میں پیارے لہجے میں خوبصورت ترنم سے لوری گا کے سلاتی ہے۔بہترین معلّمہ کی حیثیت سے درس وتدریس کی خدمات بھی انجام دیتی ہیں۔اس طرح سے اولاد کے حق میں ہر ضرورت کی معاون و مددگار بنی رہتی ہیں۔ مذکورہ تمام قربانیوں کا ذکر آپ کی نظموں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

صادقہ نواب سحؔر اپنی نظموں کے آئینے میں

امرناتھ
(شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا اصل نام صادقہ آراء ہے۔ ان کی پیدائش ضلع گنٹور، آندھرا پردیش میں ہوئی۔ ان کے والد نام خواجہ میاں صاحب اور والدہ کا نام شرف النساء بیگم ہے۔ ان کی شادی محمد اسلم نواب صاحب سے ہوئی۔ صادقہ نواب سحر نے ایم۔ اے۔ (ہندی)، ایم۔ اے۔ (انگریزی)، ایم۔ اے۔ (اردو)، پی ایچ۔ ڈی۔ (اردو)، ڈی۔ ایچ۔ ای۔ اور سیٹ ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ فی الوقت وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر، رِیسرچ گائیڈ اور صدر شعبۂ ہندی، کے۔ ایم۔ سی۔ کالج، کھپولی، (ممبئ یونیورسٹی) ضلع رائے گڑھ، مہاراشٹر میں درس وتدریس کے میدان میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

صادقہ نواب سحر نے اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں تعلیم حاصل کی اور ان تینوں زبانوں میں اپنی دلچسپی رکھنے کی وجہ سے ادبی محاذ میں اپنا کمال دکھا رہی ہیں۔ وہ شادی سے پہلے صادقہ آرا سحر کے نام سے لکھتی رہی ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا مگر نظم ونثر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ادبی گوشوں میں ناول نویس، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، مترجم محقق، نقاد اور بچوں کی ادیبہ کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ صادقہ نواب سحر ذہین اور قابل قدر خاتون ہیں جو زندگی کی چھاؤں دھوپ کے تجربات کو بہ خوبی قلم بند کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ صادقہ نواب سحؔر نے اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ہندوستان کے مختلف شعبہ جات کے نصاب

میں بھی ان کے ادبی مضامین کو پڑھایا جاتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کو مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی، بہار اردو ساہتیہ اکادمی، اتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی وغیرہ سے انعامات و اعزازات حاصل ہوئے۔ وہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں اور بیرونی ممالک میں ادبی پروگراموں میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ان کی کتابوں کے دیگر زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ صادقہ نواب سحر کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر بھی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

یہاں ہماری مراد صادقہ نواب سحر کی شاعری سے متعلق ہے۔ ۱۹۹۶ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''انگارے کے پھول'' کے نام سے شائع ہوا اور ۲۰۰۳ء میں بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' منظر عام پر آیا اور یہ تخلیق مسلسل جاری وساری ہے۔صادقہ نواب سحر کی فن اور اسلوب کے اعتبار سے دور حاضر میں الگ شناخت ہے۔انھوں نے ادبی صلاحیتوں کے وسیلے سے معاشرے کے مسائل کی نشاندہی کی ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے معاشرے کو بیدار کرنے کی سعی کی ہے۔

صادقہ نواب سحر سیدھی سادی اور عام بول چال کی زبان کا استعمال کرتی ہیں۔وہ اپنی زبان کو ترسیلی زبان کی حیثیت سے برتنے کا ہنر جانتی ہیں۔سماجی، معاشی اور جنسی مسائل کو پیش کرتی ہیں۔وہ مثبت پہلو رکھتی ہیں اور ہمیشہ نسوانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں اور ساتھ ہی مرد اور عورت دونوں کی ذمہ داری سے بھی واقف ہیں۔ان کی زبان و بیان پر بھی مضبوط گرفت ہے۔درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود بھی ادبی تخلیقات کی راہ پر گامزن ہیں۔

ادبی تخلیقات کے سلسلے کی کڑی میں صادقہ نواب سحر کا ایک اور اضافہ آزاد نظموں کا مجموعہ کی شکل میں منظر عام پر آیا ہے۔اس مجموعے میں انہوں نے رومانی، معاشرتی، تصوف، تلمیح، لوری، طفل، دوہے اور ماہیے جیسے موضوعات پر مختلف عنوانات کے تحت کثیر تعداد میں نظمیں لکھی ہیں، جہاں یہ نظمیں دلچسپی کی باعث ہیں، وہیں ان میں سماجی اصلاح کا پہلو بھی

موجود ہے ۔آزاد نظموں کے اس مجموعے میں صادقہ نواب سحر نے مختلف موضوعات کی طرف توجہ مرکوز کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کی تخلیق میں زبان وبیان کی صفائی اور سادگی، خیال کی پختگی ملتی ہے۔ان کی نظموں میں مختلف الجہات شخصیت اور تخلیقی ہنر مندی نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنی نظموں کو ایک ایسی شے سے تعبیر کیا ہے جس میں شاعر اپنے دل کے درد کو چند الفاظ میں بیان کرتا ہے اور سماج میں ایک سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔شاعر کے دل میں کیا ہے اور وہ کس طرح اپنے جذبات کو اپنی نظموں میں بیان کرتا ہے،اس کا مظاہرہ کیا ہے،ان کی نظموں میں ہندی الفاظ کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے اور انسان کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔صادقہ نواب سحر نے اپنی رومانی نظموں میں مختلف عنوانات کے تحت تمام رومانی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

رومانی نظمیں:

کہ بچپن چھوٹ جائے گا، مدّ و جزر، گر مجھے اجازت ہو، تم شعور کی رو میں، جنگلی، شکوہ ایک جہاں ......، آوارہ فصلیں، وجود، کچھ بھول گیا، کہرے میں ڈوبی شام، اپنی بانہیں، بس ایک بار، آئندہ، بہت سے رنگ، بات ہو بھی سکتی ہے، محفل ہوئی برخواست، بجلی، یہ خاموشی کیوں؟، وعدہ، تیرا نام، غلطی، یاد رہے، تصوّر شکن، پناہ، حقیقت، جانے کیا تھا!، ابھی تو میں مری نہیں، آگ کی گاڑی، ہم دل کے زخم کس کو دکھائیں، بتائیے؟، کیسا تحفہ ہے یہ، کہاں ہیں!، اظہار، طلسماتی ادا، تہی داماں، تدبیر، مہلت، تغیر، کچھ اور، محبت روح کی ہے زندگانی، نشہ ہرن، آئینے کے سامنے، سب کہانیاں بیتی، آج اور کل، آنکھ کی پیاس، آنسو، آرزو ہے!، انجانے، بات کہہ تو دی، گلہ، باوجود، بے قرار آنکھوں میں ...، بے سوال، ساجن کو سندیش، گزارش، سنبھل اے دِل، ایک تمنا یہ بھی، بیزار سہی بیمار نہیں، رُت رُت پیار تیرا، ہم روئیں کب، کتنے دن تک، کوئی میخانہ تھا آ کاش میں، سب کچھ وہی ہمیشہ، موم کی شمع، محفل جب برخواست ہوئی تھی، مداری، ڈاکہ، حادثہ، تحریک (پریرنا)، کھنڈر، من کا دریا،

آتش کدہ، آنکھ مچولی، خواب بول دوں!۔

صادقہ نواب سحر کی ایک رومانی نظم ''اپنی بانہیں'' کی چند سطریں ملاحظہ کریں:

آج مجھے وہی ہوا ہے/ جو اتنی شدت سے کبھی نہیں ہوا تھا/تھوڑی سی سنک/تھوڑا سا پاگل پن/من چنچل

اس نظم میں صادقہ نواب سحر نے رومانی فضا کا سماباندھ دیا ہے۔اس میں سادہ، سلیس اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے جو قاری کے دل تک اثر اندوز ہوتا ہے۔ یہی نظم گو شاعر کی خوبی ہے کہ وہ جو بھی کہہ دے اس میں ترسیل زبان ہو۔نظم 'وعدہ' ایک بند ملاحظہ ہو جس میں شاعر منظر کشی کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے:

وعدہ تم سے کرتی ہوں اِس چھٹّی میں/ پھولوں کی سوغات تمہیں میں بھیجوں گی/کلیوں کے جذبات تمہیں میں بھیجوں گی/کانٹوں کے حالات تمہیں میں بھیجوں گی/ وعدہ تم سے کرتی ہوں اِس چھٹّی میں/ دل کی ہر اک بات تمہیں میں بھیجوں گی

صادقہ نواب سحر کی نظموں 'ابھی تو میں مری نہیں'، 'نبیل'، 'وش کنیا'، 'وہ کہتے ہیں' اور 'ماریشس سے لوٹ کر' میں جذبات اور احساسات اور گہرائی اور گرائی نظر آتی ہے۔'ماں اور میں'، آخر کو تو میں بھی ماں ہوں'، 'وہ ماں کہاں......!'، 'کون ہے اس دنیا میں'، 'ماں ہی نہیں ہے'، 'اپنے محسن سے'، 'وراثت'، 'بہن'، 'تم سے'، 'اسماء'، 'اولاد'، 'بابا'، 'بہنا'، 'نغمہ'، 'میرے بچے'، دلہنیں' (اپنی بیٹی کے نام)، 'سنبھالو زندگی کو:'، 'لَو میریج'، 'بڑی پیاری سی' اور 'کس نے کہا میں بوڑھا ہوں' نظموں میں عورت کا ایک اور آدرش روپ اور رشتوں کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔

ان کی نظم 'آخر کو تو میں بھی ماں ہوں' ملاحظہ ہو:

بچے جانے کیا کرتے ہیں/ مجھ کو دکھ ہوتا رہتا ہے/ اور میں ہنس کر دکھ سہتی ہوں/ آخر کو تو میں بھی ماں ہوں

صادقہ نواب سحر موجودہ دور کا مشاہدہ کر کے حال کے زمانے سے متعلق سوچ اور فکر میں آنے والے زمانے کی خبر دیتی ہیں۔موجودہ صورت حال اور تہذیب اور ثقافت کی

طرف توجہ دلاتی ہیں۔ان کی سماجی نظمیں انسان دوستی کی بہترین مثال ہیں، مثلاً:

سماجی نظمیں:

آنکھ کھول کر چلنا بابو (گیت)، بچہ مزدور، زلزلہ، ممتاز محل، بھیک، سوال جواب، آتنک وادی، تغیّر، سلسلہ، زمانے کے خداؤں سے، کیا کرتے!، آفس کی فائل، کال سینٹر، کیس، اس جہاں کا کیا ہوگا؟ ہم وطن بس آج ہی مل بیٹھ کر سوچیں ذرا، ریگنگ، امریکہ کے ایک اسکول میں، ابلا، بھکاری کی دیوالی، بنجارن، چھوٹی سی دھرتی، دھرما، دنیا کھیل تماشا، ایک جوڑی پیر، ایک تھکی سی لڑکی، گدھے، سوال، نئ مسکان، جنگیں، خودکشی، خوشبو والی، اونچے گھر کی دلہن، پہلا دِن، پرانی تصویر، پتھروں کا شہر، شکایت کیا زمانے سے، وہ جھونپڑوں میں رہنے والی ننھی سی پری۔

صادقہ نواب سحر کی نظموں میں درد اور کرب نظر آتا ہے۔ وہ انسانیت کی بات کرتی ہیں، غریبی اور مفلسی کی بات کرتی ہیں اور انسان کی بے بسی بیان کرتی ہیں۔ان کی نظم بچہ مزدور کا ایک بند ملاحظہ ہو:

دس کروڑ ہیں دنیا میں ہم/ آدھے ہندوستانی ہیں/ تین گھروں میں ایک سنا ہے/ اپنی جیسی کہانی ہے

روحانیت کی نظمیں

داتا ترے کرم سے، ربِ کریم، باقی ہے ایک تو ہی، اے دو جہاں کے مالک... (حمد)، ہولی بک، رسولؐ اللہ، نعت، یومِ شہادت (منقبت)، رب کی عنایت ایک سریکھی ہیں جن میں خدا اور صحابۂ کرامؓ اور ان کی انسان کے تئیں وابستگی کا پُر خلوص الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ایک حمد ''اے دو جہاں کے مالک...'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مصروفیت جہاں کی، اب سب تھمی ہوئی/ یاد آ گیا خدا کہ ہیں نظریں جھکی ہوئیں/ کیا

آرزو بھی کرنے کے ہوتے ہیں کچھ اصول؟/قرآن وہ کتاب ہے، سب کچھ لکھی ہوئی

صادقہ نواب سحؔر نے تلمیح میں بھی کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں ہندو مذہب کے دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے اور مذہبی اعتبار سے اپنی نظموں کے ذریعے کئی قصوں کی طرف اشارہ کیا ہے گیا۔ ان نظموں سے ان کا مقصد منظر کشی اور اخلاقی اقدار کی جانب توجہ دینا ہے۔ کچھ نظموں میں غالب، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی بھی مصوری کی گئی ہے۔ ان کی شاعر کی سوچ وفکر کا دائرہ وسیع ہے۔

تلمیحی نظمیں:

اشوک واٹِکا میں پہلی رات، شکنتلا، غالب سے، قرۃ العین حیدر، سرسوتی، میرا اسا نہیں ہیں۔ ان کی ایک نظم ''سرسوتی'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سرسوتی تم کتنی سندر، من موہن اور پیاری / ہاتھ میں اجلے کنول کو لے کر لگتی کتنی نیاری/ ساج سنگار کئے ہو لیکن سیدھی سادی صورت/ ہاتھ میں وینا، ہنس پہ بیٹھی جیسے کوئی مورت

صادقہ نواب سحر نے لوری سونے کے پلنے میں تجھ کو سُلاؤں، سوجا میرے راجکمار اور اطفال کے لیے گڑیا کہاں گئی، رب کا بول سچا جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ انہوں نے دوہے اور ماہیے بھی لکھے ہیں۔ وہ مشترکہ تہذیب کی علمبردار ہیں اور ملک کی قومی یکجہتی کی بات کرتی ہیں۔ ان کی نظم 'رب کا بول سچا' کا ایک بند ملاحظہ ہو:

یہ اُڑیا ہے، یہ بنگالی/ یہ مہاراشٹرین، یہ آسامی/ کب تک تم یہ بولو گے/ ہم اب ایک ہیں جب سوچو گے/ ہندوستانی بولو گے

صادقہ نواب سحؔر کا مشاہدہ گہرا ہے۔ انہوں نے قدرت کے مناظر پر بھی نظمیں تخلیق کی ہیں جیسے 'غضب کی دھوپ'، 'صبحِ امید'، 'سُنامی'، 'تتلی'، 'ڈھلتی شام'، 'جنگل کی بیری'، 'موسمِ برسات میں'، 'سُندر رلاونی گاتی'، 'برکھا رُت'، 'سحرِ بے کراں'۔ وہ نظم 'برکھا رُت' میں اپنے مثبت پہلو کے ذریعے زندگی کا پیغام دے رہی ہیں۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کیا برکھا رُت آئی / بادل گرجے/ اندر دھنش نے/من میں آگ لگائی / دھرتی بھیگی ایسی جیسے/جنم جنم کی پیاسی/چھٹ گئی ساری اداسی

صادقہ نواب سحؔر کی نظموں میں اردو اور ہندی الفاظ کی چاشنی شامل ہے جس کا استعمال وہ سماج کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے کرتی ہیں۔ دراصل ادب سماج کے مزاج اور رویے کی نشاندہی کرتا ہے اور معاشرے کے مصائب اور خرابیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہی کام صادقہ نواب سحر اپنی ادبی تخلیق کے ذریعے بہتر طریقے سے کر رہی ہیں جس کی جھلک ان کی نظموں میں صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے ادب میں اپنی فکر اور خیال کا مظاہرہ کیا ہے اور ترقی پسند افکار کو پیش کیا ہے جو کسی بھی سماج کی ضرورت ہوتی ہے۔ صادقہ نواب سحر عورتوں کی ہمدرد ہیں اور ان کے حقق کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ ان کے ادب میں عورتوں کے لیے ایک خاص مقام ہے۔ ان کی اصلاح اور بیداری کے لیے فکرمند ہیں۔

صادقہ نواب سحر کی نثری نظموں کے اماکن

عمران عاکف خان
(ریسرچ اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!

شیریں دہانی، صنف شاعری اور غزلوں کا ایک خاص اور بنیادی وصف ہے جو اس کی کشش اور مقبولیت کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی وفکری آسودگی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔اس وقت اس کی معنویت وافادیت دوچند ہوجاتی ہے جب اسے نثر سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔اس کے اماکن اور جہات ونکات میں اس وقت اضافے ہوجاتے ہیں اور اسے سمجھنے وبرتنے میں بھی آسانی ہوجاتی ہے نیز اس کی ترسیل وتبلیغ کے پیمانے بھی وسیع ہوجاتے ہیں۔پھر غالبؔ بھی کہہ گئے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر فکروفن کے مالکان نے اردو ادب میں ''نثری نظم'' کا چلن عام کیا۔انھوں نے اپنے بیانوں کو وسیع ہی نہیں کیا بلکہ مزید وسعتیں بخشی ہیں۔

اب یہ بحث اور سوالات تو سب ضیاع وقت کے سوا کچھ نہیں کہ نثری نظم کیا ہے؟ نثری نظم کا تخلیقی جواز کیا ہے؟ یہ کیا بلا ہے؟ اس کی شناخت وامتیاز کے کیا اصول اور ضابطے ہیں؟ اسی طرح اگر وہ نثر ہے تو، پھر نظم کیسے ہوئی اور اگر نظم ہے تو نثر کیوں کر؟ یہ سوالات واقعی ذہن وفکر کے ایوانوں کو ہلا دیتے ہیں مگر اب یہ سوالات خود ہی بے دم ہو گئے، اس لیے کہ ساری دنیا نے اب نثری نظموں کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرلیا ہے۔اس کے خدوخال کسی بھی طرح کے ہوں۔اس کے موضوعات کا انداز کچھ بھی ہو یا شعریات کسی بھی نوعیت کی مگر سب تسلیم، سب قبول۔ایک عربی کہاوت کی روشنی میں اب تو ان سوالوں کے جواب میں

یہی ادبی فتویٰ دیا جائے گا:

"لسان العوام فصیح!"

یعنی عوام کی زبان ہی فصیح ہے!

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو رسم عمومیت کے دھارے میں چل پڑے، جسے جمہور اور عامۃ الناس کے ایک بڑے طبقے کی حمایت حاصل ہو جائے اور اسے قبول عام بھی ملے تو، پھر اس پر اٹھنے والے سوالات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور اس پر جواب دینا، تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ تاہم ایسا نہیں ہے کہ نثری نظم کو مکمل ہری جھنڈی مل گئی ہو اور وہ ٹریک پر بے فکر دوڑ پڑے۔ ابھی اسے اور بھی مسائل درپیش ہیں۔

نظم یا نثم: ----!!

جیسے سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جسے جوابی مشورہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسے نظم ہی کیوں کہا جاتا ہے جب کہ صوری اور ہیئتی طور پر اس کا نظم سے کوئی علاقہ بھی نہیں ہے، مناسب تو یہ ہے کہ اسے "**نثم**" کہا جائے —— جیسے ہی یہ بحث چھڑی، اس کے مذکورہ اس نئے نام کی وکالت متعدد شعرا، ادیب اور نقاد کرنے لگے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو ادب میں اس صنف کا چلن اسی نام سے ہو اور اسے "نظم" کی بجائے "نثم" کہا/ لکھا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا نام معروف افسانہ نگار اور نقاد محمد حمید شاہد کا آتا ہے جو اسے کسی بھی طور نظم کہنے کو تیار نہیں بلکہ ان کا اصرار ہے کہ اسے "نثم" کے علاوہ کچھ نہ کہا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "ادبی حلقوں میں پھر سے نثر میں شاعری کے لیے مناسب نام کا مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اسے "نثری نظم" کہا جائے، یا پھر جس طرح آزاد نظم کو اب محض نظم کہا جانے لگا ہے، اس کا بھی سابقہ اُڑا لیا جائے؟ بحث چل رہی تھی کہ ایک صاحب نے کہا؛ مانیں نہ مانیں، نثر میں شاعری کے لیے سب سے

مناسب نام ہے ''نثم''۔ یہیں غزل کے ایک بے مثال شاعر ریاض مجید کا ذکر ہوا اور اس خاکسار کا بھی۔ ریاض مجید کا حوالہ یوں بنیادی ہے کہ اس خوب صورت شاعر ہی نے ''نثر+نظم'' سے یہ نام اخذ کر کے تجویز کیا تھا، اس نے خود نثمیں لکھیں اور اپنا ایک مجموعہ 'نثم' کے نام سے مرتب کر کے اس کا دیباچہ لکھنے کیلئے مجھے بھیج دیا تھا۔

(روزنامہ جنگ، پاکستان۔کراچی ایڈیشن۔اشاعت: ۱۲ نومبر ۲۰۱۵ء)

ایک دوسرا نام بطور شہادت وکالت، ایم ایم مغل کا پیش کیا جاتا ہے جو پاکستان کے اہم شعرا میں شمار ہوتے ہیں، وہ اپنی بیشتر نثری نظموں کو شعوری طور پر ''**نثم**'' کہتے ہیں۔ یہ بحث طویل ہوتی جائے گی اور اندیشہ ہے کہ اصل مقصد فوت ہو جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صادقہ نواب سحر کی نثری نظموں کے اماکن و مقامات پر گفتگو کی جائے۔

صادقہ نواب سحر معروف افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی علمیت و ادبیت اور فکر و نظر سے ایک جہان متعارف اور ان کا مداح ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی متعدد اور بڑی اصناف پر طبع آزمائی کی ہے، بالخصوص ان کی تازہ پیش کش ''نثری نظمیں'' خاصے کی چیز ہیں جس میں انھوں نے مشرقی، روایتی اور گاؤں دیہات کی معصوم و معنی خیز اصطلاحات کو نہایت خوب صورت پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے گاؤں اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کے رہن سہن، انداز نشست و برخاست، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے تک جیسے باریک نکات کی تصویر کشی نہایت مناسب اور اچھوتے انداز میں کی ہے، جس سے ان کی بالغ نظری اور بلند فکری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان نظموں میں ہم ماضی کے یا داستانوی ہندوستان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جیسے ہی انھیں پڑھتے ہیں، کہیں سے روحانی ہلکی ہلکی ہوائیں آ کر ہمارے وجود، ہمارے اذہان، ہمارے ہاتھوں اور ہمارے آس پاس کے ماحول کو مقدس بنا جاتی ہیں۔ ان نظموں کے اماکن، ان کی شعریات، ان کے پیام اور ان کے تقاضے و مطالبے ایک ایسے سماج کی تعمیر و تشکیل ہیں جس پر نہ صرف زمین کو ناز ہو بلکہ قدسیوں اور علیوں کو بھی رشک

ہو۔اس کے بعد جب ہم ان اماکن ومحاکات سے ذرا نیچے آتے ہیں تو ہمیں ان میں ہماری اپنی معاشرت، ہمارا اپنا سماج اور ہماری اپنی برادریاں وبین الانسانی طبقات نظر آتے ہیں۔ سیاسی اصطلاحات اور جمہوری تماشوں کے طفیل میں ملی عنایات کے ذکر بھی ہیں جنھیں انھیں عنوان دے کر برتا گیا ہے۔ چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول

''چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ ترے سسرال سے آئی ہے/ یہ بڑھیا بڑی سکھائی ہے/ سنے گی جب یہ تیری ساس/ نا آئے گا اس کو یہ راس/ کریلا نیم میں تو مت گھول/ چمارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ کبھی تو چمڑا دھوتی ہے/ کبھی تو جوتا گانٹھتی ہے/ کبھی تو گھر کو چلاتی ہے/ کبھی بچوں سے نبھاتی ہے/ تجھے مانے نہ کوئی انمول/ چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول/ تیرے تن پر آدھے کپڑے/ تو کا ہے مول رہی جھگڑے/ جو گھونگھٹ تو الٹائے گی/ نظر کو تو نہ جھکائے گی/ تو کیا سسرال کو بھائے گی!!!/ یہ دنیا کیسی جھولم جھول/ چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول!''

یہ نظم اپنے عنوان، مشمولات اور خیالات کے اعتبار سے دلت سماج کی نمائندگی کرتی ہے، جس پر سماج کے اعلیٰ طبقات، ترقی پذیر وقت اور انسانی زندگی میں برپا ہونے والے نت نئے انقلابات نے متعدد پابندیاں اور بندشیں لگادی ہیں۔ایک بڑے باپ کی بیٹی وقت بے وقت گھر سے باہر رہ سکتی ہے۔ڈسکو، ڈانس، بار، ریسلنگ پورٹ، پکنک، بیچس، کہیں بھی بے تکلف آجاسکتی ہے۔وہ کیسے بھی کپڑے، منی اسکرٹ، چست جینز، ٹاپ، بلاؤز پہن سکتی ہے مگر ایک دلت لڑکی کیلیے یہ پابندی ہے، یہ ہدایت ہے اور سماج کی اقدار متعین کرنے والوں کا یہ فرمان ہے کہ:

''تیرے تن پر آدھے کپڑے/ تو کا ہے مول رہی جھگڑے/ جو گھونگھٹ تو الٹائے گی/ نظر کو تو نہ جھکائے گی/ تو کیا سسرال کو بھائے گی!!!/ یہ دنیا کیسی جھولم جھول/ چمپارن گھونگھٹ یوں نہ کھول!''

کیا اس کے دل میں بھی امنگیں نہ جاگتی ہوں گی، جب وہ دیکھتی ہوگی کہ وہ جس گھر

میں بائی بن کر کام کرنے جاتی ہے، اس گھر کی اسی عمر کی لڑکیاں، لڑکوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر خوش گپیاں کرتی جارہی ہیں ۔کیا اس کے ہردے اور معصوم دل میں جذبے بھی اپھان نہ مارتے ہوں گے، جب وہ سمندر کے کنارے بنی کوٹھی میں جھاڑو، پونچھا، برتن مانجھی کے وقت ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے پکنک مناتے اور برگر، پزا، آئس کریم کھاتے لڑکیوں کو دیکھی ہوگی ....! مگر ہمارے ترقی پسند سماج نے اس کے یہ سب حقوق اور اس کے لیے یہ سب کچھ سوچنا، اس طرح کی خواہشیں اور امید پالنا شجر ممنوعہ قرار دے دیا ہے بلکہ پتہ چل جانے کی صورت میں عدالتی اور قانونی چارہ جوئی کے امکانات تک موجود ہیں۔

یہ نظم دلت سماج کی مکمل عکاس ہے۔ایک چمارن چھوٹی عمر سے ہی جس طرح پورے گھر، ماں باپ، بھائی بہن اور چاچی تائی کو سنبھالتی ہے، جس طرح وہ اپنا جگر سب کو گھول گھول کے پلاتی ہے اور جس طرح وہ تیز دھوپ میں اپنا بدن سیاہ کرتی ہے۔ان سب حادثات کی منظر کشی نہایت خوب صورت انداز و اسلوب میں کی گئی ہے۔نظم میں تو اس کے کاموں اور ذمے داریوں کی فہرست بہت مختصر بیان کی گئی ہے، ورنہ وہ تو اس سے بھی زیادہ اور بڑے بڑے کام کرتی ہے۔اس وقت بھی اسے خیال رہتا ہے کہ اس کا وجود بے ردا نہ ہو جائے۔وہ اپنا سر، اپنا پیٹ، اپنی کمر اور اپنی ٹانگیں اپنے کپڑوں سے مضبوطی سے باندھ کر امور انجام دیتی ہے۔وہ اگر پتھر بھی توڑ رہی ہے تو بھی اس کا سینہ بند ہے۔وہ اگر ٹھیلا کھینچ رہی ہے تب بھی اس کا پیٹ اور اس کی ٹانگیں بند ہیں۔وہ اگر گھر میں کام کر رہی ہے تو بھی اس کا سر بندھا ہوا ہے۔اسے کوئی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں، اسے تو بس فکر یہ ہے کہ اس کا وجود بے پردہ نہ ہو جائے کیونکہ وہ چمارن ہے۔وہ دلت ہے۔اسے پرائے گھر جانا ہے اور پرایا گھر اسے ایسی صورت میں ''ستی ساوتری'' ثابت کرنے والی اگنی پریکشا کے بغیر قبول نہیں کرے گا، اس لیے اسے شروع سے ہی اپنا وجود بچا کر رکھنا ہے ہرجائی انجانی نگاہ سے اور ہر ممکن و ناممکن حادثے سے۔

اس مجموعے کی ایک اور نظم ''رشتہ طے پایا ہے'' ایسا لگتا ہے جیسے گاؤں یا شہر کے کسی

سلم ایریا میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے۔ گاؤں اور شہروں کے سلم ایریاز میں ایسی ہزاروں لڑکیاں ہیں۔ ہر گھر میں ایسی نار، بطخ سی چال والی، باتونی، محنت کش اور اپنے یا سوتیلے بھائی بہنوں کو پالنے والی، اپنی خداداد صلاحیتوں سے دنیا کو حیران کر دینے والی اور دیکھنے والوں پر ہمیشہ کے لیے اپنی یاد کا نقش ثبت کرنے والی لڑکی مل جائے گی، جس کا رشتہ طے ہونے پر واقعی دل میں ہوک سے بھی اٹھے گی اور دل گھبرائے گا بھی، اعصاب پریشان بھی ہوں گے اور آنکھوں میں خوف کے سائے بھی در آئیں گے، اسی طرح حساس وجود لرز کر بھی رہ جائے گا۔ غم اس وجہ سے نہیں کہ وہ رخصت ہو رہی ہے بلکہ اس فکر سے کہ کیا اب اس کی وہ ادائیں باقی رہیں گی؟ کیا اس کی بول چال، اس کی کلیجیں بھرتی سی چال ڈھال بچی رہیں گی؟ اس وقت تو فکر اور گہری ہو جاتی ہے جب پتہ چلتا ہے کہ اس کا شوہر امیر باپ کا معذور بیٹا ہے۔ اندھا، لنگڑا، کانا، اپاہج یا آوارہ ہے۔ اس وقت تو جی ایسا کرتا ہے کہ وقت تھم جائے اور اس معصوم کی قسمت کے فیصلے بدل جائیں مگر ایسا نہیں ہوتا اور وہ ان غیر متوقع حالات کے اس دلدل میں پھینک دی جاتی ہے۔ تھوڑے دنوں بعد جب وہ ملتی ہے تو اس کی ہنسی، اس کی کلکاری، اس کی چال ڈھال، اس کا چہرہ مہرہ سب کچھ بدلا بدلا سا لگتا ہے۔

یہاں بھی سماج کے ان دونوں طبقات کا فرق واضح اور نمایاں نظر آتا ہے جن میں ایک کو 'اعلیٰ' کہا جاتا ہے اور دوسرے کو 'دلت' ۔اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہر طرح سے پرفیکٹ لڑکے سے بیاہی جاتی ہے اور 'دلت سماج' کی لڑکی قسمت میں عمر رسیدہ، گونگا بہرا اور امیر باپ کی بگڑی اولاد لکھا ہوتا ہے یا ممکن ہے ہمارا سماج ہی اسے اس کی قسمت میں لکھتا ہے۔

''کیسا دریا ہے یہ!'' نظم کے عنوان سے لگتا ہے کہ شاید حیات و کائنات کے کسی مسئلے پر بحث کی جانے والی ہے یا پانی کی خیرات دیتے دیتے سوکھ جانے والے دریا کی نادریادلی پر کوئی فلسفہ بیان ہوگا، مگر جیسے ہی اس کے ضمن میں درج سطور پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ذہن و فکر ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تو ہمارے گھروں کی بات ہے۔ یہ تو نانیوں کی بات ہے۔ یہ تو ایک ننھی اور معصوم، ایک نوعمر اور ایک دوشیزہ کی کہانی ہے جس

کے اندر ایک نانی بستی ہے۔اس میں وہ لڑکی سوچتی ہے۔اس کی ماں کسی کی نانی،اس کی نانی،اس کی نانی،وہ خود، کسی کی نانی،اس کی بیٹی، کسی کی نانی،اس کی بیٹی کی بیٹی کسی کی نانی۔ یہ کیسا دریا ہے جو صدیوں سے بہتا چلا جارہا ہے، جس کے سوتے کبھی خشک ہی نہیں ہوتے۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کی نہ ابتدا کا پتہ ہے اور نہ انتہا کا اندازہ۔نسلیں کھپتی چلی جائیں گی مگر نانیوں کا سلسلہ یعنی اس دریا کا سلسلہ ایسے ہی جاری رہے گا۔اس کے کناروں پر اسی طرح پیاری پیاری پریاں، پرندے، چوپائے، چرندے، درندے، گزندے آتے رہیں گے اور اپنی پیاس بجھا کر آسودگی حاصل کرتے رہیں گے۔ایسی صورت میں واقعی یہ سوال بنتا ہے اور اس کا جواز بھی ہے کہ ''کیسا دریا ہے یہ!''—— مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین بھی اس نظم کے مصرعوں کی گہرائی میں اتریں:

کیسا دریا ہے یہ!

میں ہوں نئی، بہت ہی نئی
مگر نہ جانے کون سی نانی کون سی ماں
مجھ میں بسی ہے!
میرے اندر میری نانی میری ماں
میری نانی میں اُن کی نانی اور ماں.....
کیسا بہتا دریا ہے یہ!
اُس نانی کو کیا معلوم !!
مگر حقیقت یہی ہے
اُن سے سیکھا اُن سے پایا ہے
وہی غلطیاں دہرائیں
یا اُن کو ٹھیک کرایا ہے
وہی محبت، وہی ہے نفرت

وہی ہے جذبات کا سمندر
جو جی گئیں وہ،
وہ کھیل اور وہ موج و مستی
وہی ہے بچپن، وہی جوانی
نہ جانے کیسا یہ بہتا پانی
وہی ہیں ممتا بھری نگاہیں
وہی ہیں ماؤں کی سرد آہیں
بہت سی باتوں پہ سر جھکانا
قصور نہ تھا پھر بھی مانا
کبھی تو یوں بھی کہ خود منانا
زمانہ بدلا، کہاں میں بدلی
میں پڑھ کے لکھ کے
زمانے بھر میں
سما گئی ہوں
مگر وہی ہوں
میں اپنی نانی کو جی رہی ہوں

''ہوڑ لگی ہے ہوڑ!''

ہوس مال وزر، مال ہونے کے باوجود بھی مزید کی طلب۔ کسی کے پاس اگر کوئی انوکھی چیز ہے تو اس کے حصول کے لیے بے چینی ہو جاتی ہے۔ کسی بڑے آدمی، کمپنی یا سوسائٹی نے کسی آفر کی پیش کش کردی بس انجام کی پروا کیے بغیر طلب گار دوڑ پڑے۔ یہ فسانے قریب کے بھی ہیں اور دور کے بھی۔ یہ تماشے میرے آگے بھی ہوتے ہیں اور میرے بعد بھی کہیں۔ ہوڑ کی بدانجامی کی خبریں اخباروں میں بھی چھپتی ہیں اور انھیں ٹی وی بھی بریکنگ

نیوز بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ فلموں اور دیگر ذرائع ابلاغ سے بھی اس رسم بد کی ترسیل و تبلیغ ہوتی ہے اور گھر گھر میں یہ کہانیاں پہنچ جاتی ہیں مگر اس کے باوجود ''ہوڑ لگی ہے ہوڑ!''—— ہوڑ کا بندہ انسان ہر طرح کی سمجھ بوجھ اور عقل و ہوش کی بات سے بے فکر ''ہوڑ'' میں لگا ہوا ہے۔

اس ''ہوڑ گری'' کو اگر انفرادیت سے اجتماعیت اور سیاست کی جانب موڑ دیا جائے تو اس کے معانی و مفاہیم میں مزید وسعتیں پیدا ہو جائیں گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سیاسی پارٹیوں کو اپنا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے یا جب ان کی کرسیوں کے دن بہت تھوڑے بچتے ہیں اس وقت وہ مسلم، دلت، اقلیت، پس ماندہ، ٹرائبل اور نہ جانے کن کن حاشیائی طبقات کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہوڑ لگا دیتی ہیں۔ پرکشش آفرس، اسکیموں کا اعلان، لبھانے والی باتیں، جملے اور بیانات، یعنی نوبت بایں جارسید کہ اگر انھیں خود کو بیچ کر بھی ووٹ ملنے کا یقین ہو جائے تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کریں۔ یہ عجیب ہی ہوڑ ہے اور اس کے مناظر بھی نہایت دل چسپ ہیں۔ بڑے بڑے کروفر والے نیتا اور لیڈر، گاؤں، گندے علاقوں اور غیر منظور شدہ کالونیوں کی تنگ و تاریک گلیوں میں پھیرا لگا کر ووٹ مانگتے ہیں۔ یہ عبرت ناک ہوڑ ہے، جس کا آغاز بھی عبرت ناک اور انجام بھی عبرت ناک۔ اس نظم کا رنگ و آہنگ دیکھیے: 'ہوڑ لگی ہے'

لگی ہے ہوڑ/ مسلمانوں کے ووٹوں پر/ پِتت دلتوں کے ووٹوں پر/ اجی نیتا کے نوٹوں پر/ لگی ہے ہوڑ! کھلا پیغام دیا جاتا ہے/ سبھی کو ساتھ لیا جاتا ہے / کئی وعدوں کے دعوؤں سے/ دلوں کو جیتا جاتا ہے/ لگی ہے ہوڑ!/

....

کھلونا بن کر رہتا ہے/ مسلماں کچھ نہیں کہتا ہے/ دلت آواز اٹھاتا ہے/ مگر کچھ کر نہیں پاتا ہے/ سیاست چلتی رہتی ہے/ نبھائیں کیسے جیون کو/ عداوت پلتی رہتی ہے............

حاصل گفتگو:

صادقہ نواب سحر کی نثری نظموں کے امکان لامحدود اور وسیع تر ہیں۔ ان کا ہدف اور

نشانہ مکمل کرۂ ارض ہے۔وہ دنیا میں بسنے والے ہر انسان سے مخاطب ہیں اوراپنی خوش بو وروشنی کے پھواریں اس پر ڈال رہی ہیں۔جس طرح سورج افق مشرق سے نکل کر پوری دنیا کوروشن کرتا چلا جاتا ہے۔دیس بھی اس سے روشن، پردیس میں اس سے تابانی۔ ملک بھی اس سے منور، غیر ملک میں بھی اس کی تنویریں۔ جوسورج شہروں کی بلندوبالا چھتوں پر چمکتا ہے،اسی کی روشنی سے گاؤں دیہاتوں کی جھونپڑیوں کے اندھیرے بھی مٹتے ہیں۔

اس مجموعے میں بے شمارفکر انگیز اور معنی آفریں نظمیں موجود ہیں۔ نئے نئے عناوین اورموضوعات کا بیان انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہےاور بالکل ''بولی ٹھولی'' والی بھاشامیں، جسے سن کر جہاں بہت اچھا لگتا ہے، وہیں بے اختیار گاؤں دیہات اوردادی نانی کے جملوں کی یاد آجاتی ہے۔ان کی چاشنی،معنویت اور نئے معانی کے آئینے میں ان کی تحلیل نفسی تو ذہن و دماغ کے بند دریچے کھولتی چلتی جاتی ہے۔ جہاں ہم ان لفظوں،ان جملوں اوران بولیوں سے محظوظ ہوتے ہیں، وہیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہماری نانی دادیاں کسی اسکول،کالج،یونیورسٹیوں کی گریجویٹس اور ماسٹرس نہ ہونے کے باوجود بھی کتنی ذہین اور جملوں والفاظ کی بنت اوران کے استعمال میں کس قدر ماہر تھیں۔وہ مختصر جملوں میں کتنی گہری گہری باتیں کرجاتی تھیں۔ان سے ہم سب واقف ہیں۔

ان نظموں نے جہاں نثری ادب کا وقار قائم کیا ہے وہیں مجموعۂ ادب میں بھی بیش قیمت اورقابل قدر اضافے متوقع ہیں۔ یہ نظمیں قارئین سے اپنے حصے کی دادخود حاصل کریں گی اوران کے دلوں پر دیرپا اثر چھوڑیں گی۔قصہ مختصر یہ ہے کہ صادقہ نواب کا یہ ایسا سحر ہے جس کی زدمیں آنے سے کوئی کوئی ہی بچے گا ،تاہم یہ ''سحر''ادب اورقاری ہر دو کے لیے مفید ہے۔مضرنہیں!اس کی زدمیں آنے سے بیگانگی نہیں ،ہوش وخردمندی کے مدارج ہی بلند ہوں گے۔''شم'' کی یہ سوغات،اردوادب کے شبستاں میں اجالے ہی پیدا کرے گی۔اسی طرح مردہ احساس میں زندگی کی روح پھونکے گی۔

☆☆☆

مہاراشٹر میں ادبِ اطفال اور صادقہ نواب

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ

صادقہ نواب سحرؔ کھپولی ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر) سے تعلق رکھتی ہیں۔ بیک وقت وہ شاعرہ بھی ہے، کہانی کار بھی، ناول نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نویس بھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک کالج میں فی الحال ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ہندی پڑھاتی ہیں مگر ہندی سے زیادہ اردو والوں میں مقبول ہیں۔ حال ہی میں سہ ماہی اسباق پونے نے ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے فن اور شخصیت پر ایک ضخیم سا گوشہ شائع کیا ہے۔

کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ نہ صرف ریاست مہاراشٹر سے بلکہ پورے ملک سے انھیں ان کی خدمات کے عوض مختلف انعامات واعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بچوں کے لیے ان کی تخلیقات ملک کے موقر جرائد ورسائل کی زینت بھی بن چکی ہیں۔

حال ہی میں ان کی ایک منظوم کتاب بعنوان ''پھول سے پیارے بچے'' منظر عام پر آ کر داد و تحسین پا چکی ہیں۔ اس کتاب کی منظومات کے متعلق قمر صدیقی ایڈیٹر اردو چینل ممبئی رقمطراز ہیں:

> ''اس مجموعے میں شامل نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر لکھا گیا ہے ہلکے پھلکے اور روزمرہ کے موضوعات کو صادقہ نواب سحرؔ نے نظموں کا روپ دے کر بچوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کیا ہیں''۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر نے بھی بچوں کے لیے تخلیق کرتے وقت ان کی نفسیات اور ان

کی پسند اور نا پسند کا خیال رکھا ہے۔ ان کی ہر نظم میں اصلاحی پہلو ضرور ہے۔ وہ دراصل ''مستقبل'' کو سنوار رہی ہیں، لہٰذا اس میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی ہیں۔ کسی نظم میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے قابل اعتراض کہا جا سکے۔ آسان الفاظ اور کہیں کہیں ہندی آمیز مگر سہل زبان کا استعمال نظم کی چاشنی میں مزید مٹھاس گھول دیتا ہے۔ دوررس نتائج کی حامل یہ نظمیں دراصل ریگستان میں نخلستان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ کتب بینی سے کم تعلق یا لاتعلق کے اس دور میں ادب اطفال میں جو کچھ کہا لکھا جا رہا ہے وہ بہر حال غنیمت ہے۔

نظم ''آؤ دعا مانگیں'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آؤ دونوں ہاتھ اٹھائیں　　مانگیں اپنے رب سے دعائیں

مَولا، ہم کو نیک بنا دے　　علم و ہنر تو ہم کو سکھا دے

امی ابو بہن اور بھائی　　ہم نے محبت ان سے پائی

اپنوں سے ہم کریں محبت　　یہی ہے دولت، اسی میں برکت

پڑھنے لکھنے میں ہوں آگے　　سوئے تھے پر اب ہیں جاگے

اچھے، سچے، نیک بنیں ہم　　سارے مل کر ایک بنیں ہم

مَولا، تیری شان نرالی　　دعا ہماری جائے نہ خالی

صادقہ نواب سحرؔ کی نظمیں اور کہانیاں بچوں کے لیے بہر حال بیش بہا تحفہ ہیں۔ ان کی نظمیں جہاں بے شمار خوبیوں سے مزین ہیں۔ وہیں ان میں ترنم اور لَے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

('ادراک و امکان کے مابین'، ڈاکٹر کلیم ضیاء، ادب الاطفال میں خواتین کا حصہ، ریاست مہاراشٹر کے تناظر میں، مقالے سے، سہ ماہی اردو امراوتی، ۲۰۱۴ء)

بچوں کی دلچسپی کا انوکھا سامان

قمر صدیقی (ممبئی)

دنیا کی سبھی زبانوں میں بچوں کے ادب کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے اور دنیا کی سبھی چھوٹی بڑی زبانوں کے تقریباً تمام بڑے چھوٹے ادیبوں نے بچوں کے ادب کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ نہ صرف محسوس کیا بلکہ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں، نظمیں اور ڈرامے وغیرہ بھی تحریر کیے۔ اس صنف میں علامہ اقبال سے لے کر ایڈ گرایلن پو تک کتنے ہی جید ادیب وشاعر شامل ہیں۔

ہماری پیاری زبان اردو میں بھی بچوں کے لئے لکھی جانے والی تحریروں کی کوئی کمی نہ تھی۔ ''کھلونا''، ''نور''، ''ہلال''، ''پیام تعلیم''، ''اور ''امنگ'' جیسے بچوں کے معیاری رسالے پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوتے تھے مگر ادھر پچھلی دو ایک دہائیوں میں بچوں کے ادب کی طرف ادیبوں اور دیگر لکھنے والوں کی توجہ کم ہوئی ہے۔ ہر چند کہ ان میں سے کچھ رسالے اب بھی شائع ہوتے ہیں اور بچوں کے لئے ایک معیاری رسالے مثلاً ''گل بوٹے'' اور ''غبارے'' وغیرہ بھی شائع ہونے لگے ہیں لیکن اس کے باوجود اردو میں بچوں کے ادب کی صورت حال کو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

پھر ایک زمانے میں جب برق رفتار ترقیوں کی مار سب سے زیادہ بچوں اور بچپن پر پڑ رہی ہے تو ایک ایسے ماحول میں یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو کے ادباء وشعراء بچوں کے ادب کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہی بچے ہماری تہذیب، ہماری زبان اور ہمارے ادب کے معمار ہیں، لہٰذا تہذیب اور زبان کی بقاء وتحفظ اور وسعت

کے لئے بچوں کو پرنٹ لٹریچر کی طرف متوجہ کرنا آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

صادقہ نواب سحر اردو کی ادبی دنیا میں معروف نام ہے، خصوصاً اپنے مخصوص نسائی لب ولہجہ کی شاعری کے باعث وہ اردو شاعرات میں منفرد مقام ومرتبہ کی حامل ہیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ ادھر انھوں نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ فرمائی اور بچوں کے لیے ان کی نظموں کا یہ خوبصورت مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس مجوعے میں شامل نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھیں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ لکھا گیا ہے۔ ہلکے پھلکے اور روز کے موضوعات کو صادقہ نواب سحر نے نظموں کا روپ دے کر بچوں کی دلچسپی کا سامان کیا ہے اور شاید اسی خصوصیت کے باعث یہ مجموعہ بچوں میں مقبول بھی ہوگا، انشاءاللہ۔

('پھول سے پیارے جگنو'، اردو چینل پبلکیشنز، ممبئی، ۲۰۰۳ء)

☆☆☆

بچوں کی ادیبہ صادقہ

آر پی شرما مہرشؔ، (ممبئی)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ (ایم۔اے اردو، ہندی، انگریزی) صدر شعبۂ ہندی کے۔ ایم۔سی کالج کھوپولی ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر) بیک وقت مصنفہ تنقید نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، تذکرہ نگار، نثر نگار، صحافیہ واقع ہوئی ہیں اور معروف غزل گو شاعرہ ہیں۔ان کی کئی اردو ہندی تخلیقات شائع ہو کر منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ان تخلیقات میں ''پھول سے پیارے جگنو'' بچوں کے لئے ان کا شعری مجموعہ بھی شامل ہے۔اپنی ادبی خدمات کے لئے ڈاکٹر صادقہ نواب کو کئی اعزاز و انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

جہاں تک بچوں کے ادب کا تعلق ہے، اُنہوں نے بچوں کے لئے نظموں کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' اس قدر پسند کیا گیا اور کامیاب رہا کہ اُس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی اور چند اِضافوں کے ساتھ شائع ہونے جا رہا ہے، جو یقیناً بچوں کیلئے مزید دلچسپی کا باعث ہوگا اور وہ اس سے زیادہ لطف اندوز اور مستفیض ہو سکیں گے۔اُن کا یہ نیا ایڈیشن ۴۴ نظموں پر مشتمل ہے۔

اِس شعری مجموعے میں جہاں 'کاغذ کی ناؤ'، 'ریل'، 'گڑیا رانی'، 'چڑیا'، 'چڑیا گھر'، 'پنچھی' اور 'تتلی' وغیرہ جیسی بچوں کی دل پسند نظمیں ہیں تو وہیں رشتوں کی اہمیت کو شدت سے ذہن نشیں کراتی ہوئی 'مینا رانی'، 'دیدی کے گن گاؤ'، 'پانی'، 'اپنی کہانی' اور 'ماں باپ کا دلارا' جیسی نظمیں بھی ہیں۔ 'بارش'، 'برکھارت'، 'قوس وقزح'، 'گرمی آئی' اور 'سورج' جیسی نظمیں بچوں کو موسموں سے متعارف کرانے اور قدرت سے قریب لانے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔بچوں کو اس سے بھی روشناس کرایا گیا ہے۔'ڈاکٹر عادت سدھار'

والی نظم بری عادتوں مثلاً جھوٹ، چغل خوری، وہم سے دور رہنے کی ہدایت کرتی ہے۔ کتابوں سے دلچسپی اور ایک سے بیس تک گنتی سکھانے والی نظمیں بھی ہیں۔

بچوں میں حب الوطنی اور یک جہتی کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے 'اشفاق اللہ خان'، 'باپو'، 'گاندھی' اور 'تم تو ہو بھارت کا گہنا' عنوانات والی نظمیں یقیناً معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ نعتیہ نظم 'میرا رسولؐ'، ''اور اللہ اللہ بول''، ''رب کی عنایت''، ''ایک سر یکھی''، ''رب کا بول ہے سچا''، ''آؤ دعا مانگیں'' اور ''مناجات باری تعالیٰ'' ہیں۔ ساتھ ہی ''جاگ اب تو جاگ''، ''آنکھ کھول کر چلنا بچو''، ''پیڑ لگاؤ''، ''بچہ مزدوری'' اور ''مداری'' جیسی نظمیں بچوں کو پیڑوں کی اہمیت بتانے، بے زبان جانوروں سے ہمدردی اور دنیا کے فضا کو آلودگی سے پاک صاف رکھنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بچہ مزدوروں کی بہبودی بھی چاہتی ہیں اور بھی کئی اچھی نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر صادقہ نواب ایک ماں ہیں۔ اس ناطے وہ بچوں کی نفسیات، ان کی ضرورتوں اور پسند ناپسند سے پوری طرح واقف ہیں۔ بچوں کے لئے کیسی نظمیں لکھی جائیں یہ ایک ماں سے بہتر اور کون جان سکتا ہے جیسا کہ ان کے مندرجہ بالا موضوعات کے انتخاب سے ظاہر ہے۔ انہوں نے مرزا غالب کی پسند پھلوں کے بادشاہ ''آم'' پر بھی ایک نظم لکھی ہے

منظوم تخلیقات میں خصوصاً بچوں کیلئے لکھی گئی نظموں میں یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ بآسانی زبان زد ہو جاتی ہیں۔ دراصل ایسی ہی نظموں کی بچوں کے لئے ضرورت بھی ہے۔

غنایت کا یہ وصف صادقہ نواب کی نظموں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ وصف پیدا کرنے کے لئے انہوں نے ہندی کے گیت، چھندوں کا اور مترنم بحروں کا استعمال کیا ہے۔ اس کے متعلق جناب وکیل نجیب (پرنسپل اسلامیہ جونیئر کالج ناگپور) کے گراں قدر مضمون بعنوان ''ساحل''، بچوں کے شاعر سے درج ذیل اقتباس قابل ذکر ہے:

''دراصل جن موضوعات میں بچوں کی دلچسپی ہوتی ہے اور جو باتیں ہم انہیں سکھانا اور ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں، انہیں کو موضوع بنا کر جو نظمیں کہی جاتی ہیں یا

جو شاعری کی جاتی ہے اُسے بچوں کی شاعری کہتے ہیں۔ بچوں کے لئے ایسی شاعری کی جانی چاہیے جو اُنہیں اچھی لگے۔ وہ رواں اور مترنم بحر میں ہو۔ اس سے معلومات حاصل ہو۔ جو ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا سبب ہو۔ جو بچوں کو آدابِ زندگی کا سلیقہ و شعور عطا کرے۔ بچوں کے شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُسے بچوں کی نفسیات کا علم ہو۔ اُن کی پسند و ناپسند کا عرفان ہو۔ اُن کی عادتوں اور ضرورتوں کی معلومات ہو اور سلیس و آسان زبان میں اشعار کہنے پر قدرت حاصل ہو۔''

(قرطاس ناگپور۔ شرف الدین ساحلؔ)

صادقہ نواب کی نظموں کے چند بند درج ذیل ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

نظم 'آم'

کوئل کو بھی یہ للچائے/ آم کے پیڑ پہ بیٹھی گائے/ گاؤں کی گوری جھولا جھولے/ آم کے پیڑ کی ٹہنی ڈولے/ رنگ جمائے آم

نظم 'بارش کی پہلی بوچھاریں'

امی نے چھٹی بھی دی ہے/ آؤ مل کر دھوم مچائیں/ بھیگ کے آئیں بھیگ کے گائیں/ چھم چھم چھم چھم برسا پانی

اس بند میں 'امی نے چھٹی بھی دی ہے' والی بات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی بچوں کو کوئی کام بڑوں کی اجازت کے بغیر نہیں کرنا چاہیے۔

نظم 'برکھا رُت'

کیا برکھا رُت آئی/ دھرتی بھیگی ایسے جیسے/ جنم جنم کی پیاسی

نظم 'تم تو ہو بھارت کا گہنا'

لکھنا پڑھنا کچھ نہیں جانا / ہو کے بڑے کچھ نام کمانا / بچو میرا مانو کہنا / تم تو ہو بھارت کا گہنا

نظم 'کمپیوٹر'

ہوآ کاش کہ ہو پاتال / کہتا دنیا بھر کے حال / نظمیں لکھنا اسکو آتا / گانے گاتا ساز بجاتا

نظم 'دیدی کے گن گاؤ'

مُنّا: دیدی روٹھی ہے مجھ سے / مارے صبح مجھے گھونسے

امّی: چھیڑا تھا تم نے پہلے / یہ تو مانتے ہو مُنّے / جو چاہو تم وہ پاؤ / دیدی کے گن تو گاؤ

یعنی دیدی عمر میں تم سے بڑی ہے۔ اُس کے روٹھنے اور مار میں بھی پیار ہے۔ اُس کے ذرا گن تو گاؤ تمہیں سب کچھ ملے گا۔

نظم 'پھول سے پیارے جگنو'

سارے دھرم بس یہی سکھاتے سچائی پر مر جانا / دیش جڑاؤ کنگن ہے تم ہیرا بن کنگن میں رہو / ماں کی آنکھوں ہی میں سب نے جیون کا امرت پایا / چاہے جتنی کرو ترقی پیار کے ہی گلشن میں رہو

نظم 'قوس قزح'

قدرت خدا کی جیسے کوئی شاہکار ہے / قوس قزح نہیں ہے یہ فطرت کا پیار ہے

نظم 'ریل'

جیسے قیدی چھوڑے جیل / اسٹیشن نے نکلی ریل

'میرا رسولؐ'

ساری اُمت کے وہ رسول/ خوشبو اُن کی جیسے پھول

نظم 'کس نے کہا میں بوڑھا ہوں

دیکھو میری گود میں یہ/ ننھا مُنا لال جو ہے/ یہ میرے ہے لال کا لال/ یہی تو میری کہانی ہے/ یہی تو میری جوانی ہے/ کس نے کہا میں بوڑھا ہوں؟

نظم 'رب کی عنایت ایک سریکھی'

چاہے رنگ ہو گورا کالا/ چاہے کوئی مذہب ہو نرالا/ ہند کا باسی یا امریکی/ رب کی عنایت ایک سریکھی

نظم 'بچہ مزدور'

ماں کہتی ہے جارے بچے/ کچھ تو کما کر لارے بچے/ لاکھ بری بچہ مزدوری/ لیکن لاچاری مجبوری/ ہم کو مزدوری نہ ملی تو/ بھوکے مر جائیں گھر والے

اس مجموعے کی تمام تر بچوں کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بچوں کو ڈاکٹر صادقہ نواب کی جانب سے یہ ایک بہت ہی خوبصورت تحفہ ہے۔ آئندہ بھی آپ بچوں کو ایسے ہی نایاب تحفے عطا کرتی رہیں گی، ہمیں ایسی امید کامل ہے، آمین۔

☆☆☆

پھول سے پیارے جگنو

سراج عظیم (دہلی)

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ ضلع رائے گڑھ، مہاراشٹر کی ایک معروف شاعرہ ہیں۔ان کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ ان کی شاعری نسائیت کے لب و لہجے سے بھرپور ہے جو ان کو دوسروں سے منفرد کرتی ہے۔ڈاکٹر صادقہ نواب سحر گو کہ قومی زبان ہندی کی پروفیسر ہیں اور ہندی سے ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان کا ادبی سرمایہ بھی زیادہ تر ہندی میں ہے لیکن ان کو اپنی مادری زبان اردو سے والہانہ محبت ہے۔ان کا ایک شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول''، شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔سحرؔ ایک ادیبہ، شاعرہ، ڈرامہ نگار اور مترجم ہیں۔کئی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ان سب کے باوجود ان کو بچوں کے ادب سے خاص شغف اور دلچسپی ہے۔بچوں کے لئے دلچسپ نظمیں ہوں یا ان کے لئے ڈرامہ ہو سحرؔ بچوں کا ادب اردو میں ہی تخلیق کرتی ہیں۔یہ امر کسی بھی سماج اور سوسائٹی کے لئے خوش آئند تعبیر کے مترادف ہے کہ کوئی ادیب بیک وقت کئی زبانوں کو نہ صرف جانتا ہو بلکہ ان پر اس کو عبور حاصل ہو اور ان کے ذریعہ وہ سماج کی صحیح تصویر پیش کر سکے، ایسی شخصیتیں سوسائٹی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔صادقہ نواب سحرؔ اس خوبی سے مزین ہیں۔

بچوں کا ادب تخلیق کرنا یوں تو مشکل نظر آتا ہے لیکن جس طرح سے سحرؔ نے بچوں کے ادب کو تخلیق کیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ وہ ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔انھوں نے بچوں کے کئی ڈرامے تحریر کئے ہیں اور وہ ڈرامے مختلف ڈرامہ فیسٹولز میں انھوں نے اسٹیج بھی کرائے ہیں۔جو داد و تحسین حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف زمروں کے انعامات سے

سرفراز ہوئے ہیں۔اب بچوں کی نظموں اور گیتوں پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' منظرِ عام پر آیا ہے۔

بچوں کا ادیب ہونا کانچ کے گھر میں قدم رکھنے کے برابر ہے۔کیونکہ بچوں کا دل ودماغ بالکل کانچ کی طرح ہوتا ہے۔اس کو ہم جو بھی رخ دیں گے،اس کا عکس ہمیں ان کی شخصیت میں دکھائی دے گا۔اس کے برعکس اگر کوئی شئے ایسی ہے جو بچوں کے حساس طبع پر گراں گزرتی ہے تو بالکل کانچ کے گھر پر پتھر مارنے کی طرح ہوتا ہے،اس لیے بچوں کے ادیب یا شاعر کا بچوں کی نفسیات، ذہنی استعداد اوران کی دلچسپیوں سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔اگر بچوں کا ادیب یا شاعر ایک عورت ہو تو 'نورٌعلی نور' کے مترادف ہے، کیونکہ ایک عورت کا ممتا کے جذبے سے سرشار ہونا اس کی شخصیت کا جزولاینفک ہے۔ڈاکٹر سحر ایک حساس شاعرہ، قابل مدرس اور شفیق ماں بھی ہیں،اس لیے وہ بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی استعداد،ضروریات ومسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ادب کے تعلق سے صادقہ نواب سحر کئی صفات کی حامل ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ دونوں عمیق ہیں۔زیرِ نظر مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' بچوں کے لیے نرم جذبۂ احساس کا ہی پرتو ہے۔انھوں نے مختلف موضوعات پر بچوں کی ذہنی استعداد اور فکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے دلنشیں انداز میں بڑی دلچسپ اور شیریں نظمیں کہی ہیں۔بچہ ایسی افتادِ طبع کا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شئے اس کی طبع کی دلچسپی کا باعث نہ ہو تو اس سے اکتا کر اسے فوراً چھوڑ دیتا ہے اور اپنی دلچسپی کا سامان تلاش کرنے کے لیے دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔اگر کوئی نظم یا گیت ایسا ہو جو بچہ گنگنا کر یا روانی کے ساتھ نہ پڑھ سکے تو وہ فوراً یا تو اس صفحے کو چھوڑ دیتا ہے یا کتاب بند کر دیتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کا کلام اس طرح کی عدم دلچسپی سے پاک ہے۔ان کی نظموں، گیتوں اور نعتوں میں شعری آہنگ موجود ہے۔وہ کافی مترنم اور رواں ہیں۔'پھول سے پیارے جگنو' کی کچھ نظمیں پند ونصیحت سے آراستہ اور سبق آموز ہیں۔کچھ نظمیں ایسی ہیں جو صرف بچوں کی عجیب وغریب حرکات، ان کی بچکانہ سوچ اور ان کی افتادِ طبع کی مظہر ہیں۔کچھ نظمیں

شہیدانِ وطن کے اوپر ہیں تو کچھ عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات گردوپیش کی اشیاء اور جگہوں کے سلسلے میں ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ نعت ومنقبت بھی ہیں۔مجموعے میں شامل ایک نظم ''چڑیا'' آخری بند ملاحظہ فرمائیے:

دانا چگ کر ذرا سا رک کر- پھر اڑ جاتی چڑیا
چہک چہک کر لہک لہک کر-تان سناتی چڑیا
پھرتیلی ہوں البیلی ہوں-سبق سکھاتی چڑیا

حالانکہ صادقہ نواب سحرؔ کی شاعری میں ہندی الفاظ اور ان کی تراکیب کا استعمال کافی ہے، پھر بھی ان کی نظموں اور گیتوں میں روانی الفاظ اور ترنم ہے جو معصوم قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔سفید کاغذ پر چھپی اور تصاویر سے مزئین کتاب کی قیمت بہت مناسب دس روپے ہے، جس کو بآسانی خرید کر پڑھا جاسکتا ہے۔مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ کی اس کاوش کو سراہا جائے گا اور اس کو قبول عام حاصل ہوگا۔

☆☆☆
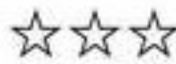
پھول سے پیارے جگنو: بچوں کے لیے پیارا سا تحفہ

غازی معین

تقریباً ہر زبان میں بچوں کے ادب کو کافی اہمیت حاصل رہی ہے اور بے شمار ادیبوں اور شاعروں نے بچوں کے ادب کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے خاص طور پر بچوں کے لئے نظمیں کہانیاں اور ڈرامے تحریر کیے ہیں ۔ علامہ اقبالؔ اور اسماعیل میرٹھیؔ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے بھی پہچانے گئے لیکن گذشتہ بعض دہائیوں سے اردو زبان میں بچوں کے ادب کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا جارہا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ بچوں کے لیے کوئی لکھنے والا نہیں ملتا۔ کوئی رسالہ یا کتاب خاص طور پر بچوں کے لیے شائع نہیں کیے جاتے، حالانکہ بعض رسالے یا کتابیں بچوں کے لیے نکلتی ہیں لیکن ان کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں میں پڑھنے اور لکھنے کی دلچسپی کم ہوتی جارہی ہے۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ مبارک باد کی مستحق ہیں ۔انہوں نے بچوں کے لیے لکھی اپنی نظموں کا ایک حسین مجموعہ ''پھول سے پیارے جگنو'' شائع کروایا۔ صادقہ نواب سحرؔ ادبی دنیا میں نیا نام نہیں ہے۔ وہ کے۔ ایم سی کالج رائے گڑھ میں شعبۂ ہندی کی صدر ہیں۔ صادقہ صاحبہ نے ایم۔ اے اردو، ہندی، اور انگریزی زبانوں میں کیا ہے اور پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کے تعاون سے ان کا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' کے نام سے شائع ہوکر خراجِ تحسین پا چکا ہے۔ ہندی میں انہوں نے مجروحؔ سلطان پوری کی کلیات ''پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' بھی چھاپی۔ ان کی شائع شدہ تیسری کتاب ہندی زبان میں ''لوک پریہ کوی مجروحؔ'' ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ نے بہت سادہ الفاظ میں روزانہ کے موضوعات کو نظموں کی

شکل دی ہے۔ مجموعے میں بچوں کی دلچسپی کے انوکھے سامان موجود ہیں۔ بچوں کی نفسیات کے پیش نظر ہی محترمہ نے سادہ زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔ مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کے عنوان سے انہوں نے اپنی نظم میں لکھا ہے۔

تھا لال علی گڑھ کا وطن کمال تھا
تقریر میں تھا جوش غضب کا جلال تھا

''کتابیں'' کے عنوان سے انہوں نے لکھا ہے۔ اچھی کتابوں کا جو اثر ہوگا وہ اچھا ہی ہوگا، بری کتابیں بری طرح سے برا بنائیں گی ہم کو۔ صادقہ نواب سحر نے اپنی نظموں میں اصلاحی پیغام بھی دیا ہے۔ بچوں کو بامقصد تفریح کرانے کا سامان فراہم کیا ہے۔ ''پھول سے پیارے جگنو'' نامی نظم میں انہوں نے تحریر کیا ہے۔

بچپن کی چھوٹی چھوٹی یادوں میں جیون کٹا ہے
سحر سے پوچھا یہی کہا ہے یادوں کے مدھوبن میں رہو

کتاب کے آخر میں دو گیت بھی ہیں۔ ایک گیت ''آنکھ کھول کر چلنا بابو'' اور دوسرے ''آنکھ کھول کر چل'' میں محترمہ لکھتی ہیں۔

اپنے گن پہچانو یارو/ اپنا بھروسہ جانو یارو

دوسرے گیت ''جاگ اب تو جاگ'' میں وہ لکھتی ہیں۔

پتھروں پر نام لکھ دو
کارناموں کے قلم سے
جاگ اب تو جاگ۔

دس روپئے کی کتاب میں بچوں کے لیے کافی مواد جمع ہے اور ان کی دلچسپی کے لیے عمدہ سامان۔ سرورق پر کشش ہے اور صاف چھپائی سے بچوں کے لیے یہ کتاب بہترین تحفہ ہے۔

(روزنامہ اردو ٹائمز، ۶۔۱۱۔۲۰۰۳ء)

☆☆☆

نقد پارے

شمس الرحمن فاروقی :

آپ کا مختصر سا مجموعہ کلام ''انگاروں کے پھول '' ملا تھا۔شکریہ۔میں نے اسے جگہ جگہ سے پڑھا اور جگہ جگہ مجھے اچھے اچھے شعر نظر آئے میں بھی جناب رفیعہ شبنم کی آواز میں آواز ملا کر کہتا ہوں کہ آپ کا آغاز سفر خوشگوار انجام کی خبر دیتا ہے۔

☆☆

حقانی القاسمی

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اس خوبصورت احساس کی حامل ہیں جو خزاں کو بھی بہار میں بدل دیتا ہے اور ریگ زار کو بھی گلزار بنا دیتا ہے۔وہ بہت مثبت اور تعمیری ذہن رکھتی ہیں۔ ہر باب میں ان کا نقطۂ نظر متوازن ہے۔وہ گو کہ عملی طور پر ہندی ادبیات سے وابستہ ہیں مگر اردو میں بھی ان کا ایک الگ مقام ہے۔ایک فکشن نگار، ڈرامہ نگار اور تنقید نگار کی حیثیت سے وہ اپنی الگ شناخت بنا چکی ہیں۔ان کا ایک ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' ادبی حلقوں میں موضوع بحث رہا اور یہ ناول اردو، ہندی اور تیلگو زبانوں میں بھی شائع ہوا۔ اس کا ایک ایڈیشن پاکستان سے بھی طبع پذیر ہوا۔ان کے افسانوں کا مجموعہ 'خلش بے نام سی' اور ڈرامہ کا مجموعہ 'مکھوٹوں کے درمیان' بہت مقبول ہوئے۔ ہندی اور انگریزی میں بھی ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مختلف تنظیموں اور اداروں نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اعزازات سے نوازا ہے۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، صادقہ نواب سحر سے انٹرویو سے، ۲۱ ستمبر ۲۰۱۴ء اتوار)

ڈاکٹر برج ولبھ مشرا رنگ اچاریہ

(ساہتیہ شرومنی نیشنل پروفیسر، رنگ کرمی، متھرا، یوپی)

''پتھروں کا شہر'' پڑھا، کمال کا لکھا ہے۔ مالک آپ کو بلندیوں پر لے جائے۔ آپ کی ہر تخلیق میں ایک الگ قسم کا تیور ہے۔ جو اپنی چھٹپٹاہٹ (بے چینی) ظاہر کرنے کو مچلتا رہتا ہے۔

☆☆

عبد الاحد ساز

محترمہ صادقہ نواب سحر صاحبہ

آداب!

امید ہے اچھی ہوگی 'سرگوشیاں زمانوں کی' پر آپ کا خوبصورت تبصرہ موصول ہوا۔ شکریہ گزار ہوں۔ تبصرہ خاصا مسبوط بھی ہے اور سب سے زیادہ اہم بات میرے لئے تو یہ ہے کہ آپ نے کتاب کو غور سے پڑھ کر وابستگی کے ساتھ لکھا ہے۔ میری شاعری پر کئی پہلوؤں سے نظر ڈالی ہے اور کئی نکات اجاگر کئے ہیں۔ وہ بھی محض معروضی طور پر نہیں بلکہ اپنی شخصی رائے کے ساتھ۔ کسی بھی فن پارے ہر اہل نقد ونظر کے تجربے اور بحث اپنی جگہ، لیکن کسی ہم عصر قلم کار اور قاری کے شخصی تاثرات زیادہ قربت اور اہمیت رکھتے ہیں۔

آپ کا شعری مجموعہ ''پتھروں کا شہر'' ابھی پڑھ رہا ہوں۔ اطمینان سے پڑھ کر اپنے تاثرات سے آپ کو آگاہ کروں گا۔ یہ بھی طے ہے کہ آپ کے کلام کو ناقدانہ نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ایک دوست قاری کی طرح پڑھوں گا۔

ڈاکٹر شوبھناتھ یادوں کا فلیپ جامع اور متوازن ہے۔ 'پیش لفظ' کے عنوان سے ڈاکٹر مادھوری چھیڑا کا دیباچہ جتنا مشکل اور ادق زبان میں لگا لکھا ہوا ہے۔ آپ کا اظہارِ خیال

'حادثوں سے اُپجی نظمیں' اتنا ہی سادہ اور پیارا سا ہے۔ دراصل مدعا تو آپ کی نظمیں ہیں۔ بات تو اس پر ہوگی۔ خلوص کے ساتھ

۲۴/ اکتوبر ۲۰۰۸ء

☆☆

پروفیسر نند لال پاٹھک

آدمی لگاتار چلتے ہوئے کہاں تک پہنچ سکتا ہے، اس کی مثال صادقہ کی ترقی ہے۔ دھیرے دھیرے لیکن مسلسل چلتے ہوئے آج وہ جس مقام پر پہنچی ہے، وہ دوسروں کے لیے ایک آدرش ہے اور بہتوں کے لیے تحریک۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ میری شاگرد ہے جس پر میں فخر کرسکتا ہوں۔

(سکریٹری مہاراشٹر ہندساہتیہ اکادمی، سابق صدر شعبۂ ہندی، صوفیہ کالج، ممبئی)

☆☆

ہارون رشید علیگ

گھر بسانے کے تصور میں مگن صادقہ نواب سحرؔ

صادقہ نواب سحر، بساط شعر و ادب پر نووارد سہی لیکن ان کے کلام میں کوئی کھونٹ نہیں نکالی جاسکتی۔ زبان و بیان صاف اور سادہ، مدعا واضح اور ہر طرح کے جذبات و احساسات کا ترجمان ملتا ہے۔

صادقہ نواب سحر کا شعری مجموعہ ''انگاروں کے پھول'' رطب و یابس سے پاک اور ایک عورت کے معصوم جذبات کی عکاسی کے لحاظ سے کافی بھاری ہے۔ فیشن زدہ جدیدیت کے زوال نے نئی نسل کے ہونہار فنکاروں کو جو نیا راستہ دکھایا ہے، وہی راستہ صادقہ نواب سحرؔ

نے اپنایا ہے۔صاف اور سیدھی سادی لیکن دل میں اتر جانے والی شاعری کی طلب فی زمانہ اپنے عروج پر ہے۔لوگ پیچیدہ اور دوراز کار مکانی اور مفاہیم سے اب دور بھاگتے ہیں۔ صادقہ کی شاعری معیاری ہے اور اگر مشق سخن جاری رہتی ہے تو یہی ان کی کامیابی کی دلیل بھی بن سکتی ہے۔

(روزنامہ انقلاب ۷ دسمبر ۱۹۹۷ء)

روھتاش واستھانا (ہردوئی)

۱)ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے پاس وہ سہج، سادگی سے لبریز سلیس رواں بھاشا ہے جو غزل کو عام آدمی کی اپنی ذریعۂ اظہار کی طاقت عطا کرتی ہے۔وہ کبھی حالات کے ساتھ خود کو ڈھال لینے کا پیغام دیتی ہیں تو کبھی محبت سے خوشیاں نہیں غم مانگتی ہیں۔

غزل اپنی پیدائش سے جذبۂ محبت کی داستان گورہی ہے۔سحر کی غزلوں میں محبت کی نزاکت اور خاموش سپردگی کا فنکارانہ اظہار ہے۔ جب کوئی ہماری زندگی میں مرکز بن کر اندرون قلب بسیرا کرنے لگتا ہے تو باہری روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ وہ اپنے خاص انداز میں اس فلسفیانہ حقیقت کو بھی شاعری کا جسم عطا کرتی ہیں کہ زندگی میں جب بے تمنائی کے جذبات عمل پیرا ہوتے ہیں۔عبادت ذریعہ بھی بن جاتی ہے اور منزل بھی، عبادت گاہ کو محض بے غرض عبادت کے لیے پانے کی خواہش ان کی شاعری میں عبادت کی پاکیزگی کو شامل کردیتی ہے۔

۲)

صادقہ نواب کی ہندی نیچر کی غزلیں ان کے دل کی گہرائیوں کو چھو کر از خود وارد ہوئی ہیں۔ان کی غزلوں میں وصل وفراق کے رومانی رنگ کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقت کی گونج بھی ہے۔ چونکہ وہ اردو فارسی کی جانکار ہیں، لہٰذا فن کے نقطۂ نگاہ سے بھی ان کی

غزلیں قومی بن سکیں۔

(۱)۔ سمے کے سارتھی

۲)۔'غزل پنچ دستی' ہردوئی، اتر پردیش)

☆☆
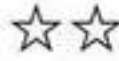
ستیش 'ساگر'

صادقہ نواب سحر کی نظمیں بے حد اچھی لگیں۔ ذاتی تجربات سے گزرتی ہوئی ان کی تخلیقات سماج سے بات کرتی ہیں یا سماج کی بات کرتی ہیں تو اثر چھوڑتی ہیں۔ میں تو دھنیہ ہو گیا۔

(سب ایڈیٹر، ہندوستان، نئی دلی)

☆☆

ڈاکٹر شیو کمار مشر (مشہور نقاد)

''ڈاکٹر صادقہ نواب کی نظموں و کویتاؤں کا مجموعہ ''پتھروں کا شہر'' جن تمام نکتوں پر ہمارا دھیان کھینچتا ہے، ان میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ انہوں نے پتھروں کے اس شہر کے باشندوں سے اپنے جذبات میں ساجھے داری چاہی ہے۔

جس کے مترادف ہماری آج کی دنیا اور آج کا سماج بنتا جا رہا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم آج ایک ایسی دنیا، ایک ایسے سماج اور ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جو نہ صرف انسانی جذبوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے بلکہ آدمی کی آدمیت کے لیے بھی بہت بڑا چیلنج ہے۔''

(پھر کھلے پھول، غزلیں، صادقہ نواب سحر، پری درشیہ پرکاشن، ممبئی، ۲۰۱۸ء)

قتیلؔ راجستھانی

'انگاروں کے پھول' اور میری بات

بزم فکر وفن کی جانب سے ہر سال ایک دو کتابیں ضرور شائع کی جاتی ہیں۔ ویسے کئی کتابیں اشاعت کیلئے وصول ہوتی ہیں لیکن بزم کی جانب سے اُنہی کتابوں کی اشاعت عمل میں لائی جاتی ہے جو بزمِ فکر وفن کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔

کتابوں کی اشاعت کے علاوہ بزم کی جانب سے ممتاز شعراء کی خدمات کے اعتراف میں شہر کی ممتاز ادب دوست شخصیتوں کے تعاون سے جشن منائے جاتے ہیں۔ جشن قمرؔ جلال آبادی ۱۹۸۳ء، جشن استاد نسیم اجمیری ۱۹۸۵ء، جشن لائلپوری، جشن رئیسؔ بلوّی ۱۹۸۷ء، جشن کاملؔ چاند پوری ۱۹۹۱ء، موسیقار اعظم نوشاد علی کے شعری مجموعے ''آٹھواں سُر'' کی رسم اجرا تقریب اور جشن مجروح سلطانپوری عظیم پیمانے پر منائے گئے۔ مذکورہ بالا تقاریب کے موقعوں پر ہمیں سرپرستوں، معاونوں اور ارکان کا پورا پورا تعاون حاصل رہا جس کے لئے ہم تمام کے شکر گزار ہیں اور اُمید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی حاصل رہے گا۔

تقریباً ایک سال قبل محترمہ صادقہ نواب سحرؔ نے اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے ان کا کلام پڑھا اور اسے قابل اشاعت سمجھا۔ صادقہ نواب سحرؔ کا کلام کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ آپ اپنی گرانقدر رائے سے ضرور نوازیں۔

آج کل شعری مجموعوں کی بہتات ہے لیکن ایسے شعری مجموعے نہ ہونے کے برابر ہیں جو مقبولیت حاصل کرتے ہیں اور جنہیں عرصۂ دراز تک یاد رکھا جاتا ہے۔

صادقہ نواب سحرؔ نے اُردو، ہندی اور انگریزی میں ایم اے کیا ہے اور پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ ان کے کلام کے بارے میں ممتاز قلمکار جناب کالی داس گپتا رضاؔ اور پروفیسر رضیہ شبنم عابدی کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ صادقہ

نواب سحؔر کی شاعری عورت کے جذبات کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کا کلام جس عورت کی نظر سے گزرے گا، اُسے اپنی بات نظر آئے گی اور یہی مقبولیت کی ضامن ہے۔

مجھے توقع ہے کہ یہ مجموعۂ کلام 'انگاروں کے پھول' قارئین کو بے حد پسند آئے گا۔ میری دعا ہے کہ صادقہ نواب سحؔر کو دنیائے ادب میں وہ مقام ملے جس کی وہ حقدار ہیں۔

('انگاروں کے پھول'، صادقہ نواب سحؔر، مکتبہ فکروفن ۱۹۹۶ء)

☆☆

کملیش بخشی

صادقہ کا کوی من مناظر قدرت کا دلدادہ ہے۔ آسمان کے بدلتے رنگ ہوں یا چمپئی سیورا ہو، روپہلی چاندنی رات ہو یا بھیگی برسات ہو، اگھن پوس کی ٹھنڈی ہوائیں ہو یا پت جھڑ کی صدائیں۔ سبھی کو انہوں نے مرتسم کیا ہے۔

☆☆

ڈاکٹر شیو اوم عنبؔر

(فرخ آباد، اتر پردیش)

صادقہ نواب سحؔر کے پاس وہ سہج سرل رواں دواں زبان ہے جو غزل کو عام آدمی کی قوتِ اظہار عطا کرتی ہے۔ وہ کبھی حالات کے ساتھ خود کو ڈھالنے کا سندیش دیتی ہے اور کبھی اپنی محبت سے اس کی خوشیاں نہیں بلکہ غم طلب کرتی ہیں۔

حالات جو پیش آئیں ذرا اس سے نبھا لے
مل جائے اگر زہر دوا جان کے کھا لے

....

محبت میں جو بھی ملے ہے گوارہ
کرم گر نہیں تو ستم چاہتے ہیں
تمہاری خوشی کی ضرورت نہیں ہے
سحؔر ہم تمہارے الم چاہتے ہیں

غزل اپنی پیدائش سے ہی محبت کی داستان گو رہی ہے۔ سحؔر کی غزلوں میں محبت کی نزاکت اور خاموش سمرپن کا فنکارانہ اظہار ہے۔ جب کوئی ہماری زندگی کا مرکز بن کر روح میں بسنے لگتا ہے، وہاں باہری روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی ہے۔

کتنی ہی شمعیں بجھا دیں ہم نے
بس اسے دل میں بسا کر دیکھا

وہ اپنے خاص انداز میں اس فلسفیانہ حقیقت کو بھی شعر کی کایا عطا کرتی ہیں کہ زندگی میں جب بے غرض احساسِ محبت کبھی ذریعۂ عبادت بن جاتا ہے تو کبھی خود عبادت۔ عبادت گاہ کو بے غرض عبادت کے لیے پانے کی آرزو ان کی شاعری میں عبادت کی پاکیزگی کو سمو لیتی ہے۔

سوا اس کے کیا اور ہم چاہتے ہیں
جھکانا ہے سر کو حرم چاہتے ہیں

('غزل پنچ دشی'۔ مدیر روہتا شواستھانا، سہیوگی ساہتیہ کار پرکاشن، ہردوئی، ۲۰۱۳ء)

☆☆

رفیق جعفر (پونے)

حادثے میرے تعاقب میں سہی
یہ تو ممکن ہی نہیں ڈر جاؤں میں

صادقہ نواب سحر کا یہ شعر سماج کے ان کمزور دل عورتوں اور لڑکیوں کے لیے ہمت

دینے والا شعر ہے جو ہمیشہ ڈر اور خوف میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ شاعرہ جو خود عورت ہے جو کہ ایسے سماج میں رہتی بستی ہے، اس کے ارد گرد بھی تو وہی ماحول ہے لیکن اس کے اندر کی جو عورت ہے وہ اسے اکساتی ہے اور وہ بظاہر اپنے لیے اپنے اعتماد اور ہمت کی بات کرتی ہے لیکن زبان سے نکلی ہوئی بات پرائی ہو جاتی ہے اور وہ بھی شعر کی صورت میں ظاہر ہونے والی بات۔ اس بات میں تو اثر ہوگا ہی۔ چنانچہ شاعرہ کا یہ شعر خاص طور پر مصرعۂ ثانی 'یہ تو ممکن ہی نہیں ڈر جاؤں میں' شاعرہ کا اپنے آپ پر اعتماد قاری یا سامع کا بھی اعتماد ہو سکتا ہے۔ سماجی شعور رکھنے والی اس شاعرہ کا ایک شعر ہے ؎

دنیا کی نیت ہے بری
نیند میں بھی بیداری دے

یہ شعر پہلی قرأت میں معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن اچھے سخن فہم کی نظر سے گزر جائے تو اس کے ذہن مین دو چار قرأت کے بعد اس شعر کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور خیال آتا ہے کہ یہ ایک عورت کے دل کی آواز ہے تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ یہ آواز فطری ہے جو اس ظالم سماج میں میں جی رہی عورت کے خدشات ہیں جو دعا کا روپ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ سخن راست خالق حقیقی سے ہے، یہ سخن شاعرہ کی سماجی بیداری کا غماز ہے جسے مرد سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں محسوس کر سکتی ہیں۔ اس شاعرہ کے اور تین شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

دلوں میں حسد کے ہیں کانٹے کئی
مگر پھول لائے ہیں ہاتھوں میں لوگ

....

تم کو تہذیب سے اخلاق سے نسبت ہی نہیں
تم کو ماں باپ نے شاید نہ سکھایا کچھ بھی

....

روئے والے کو نہ روکو تم اسے رونے دو
بوجھ اتر جاتا ہے اشکوں کے نکل جانے سے

اب اپنے طور پر سوچیں کہ صادقہ نواب سحر کے ان اشعار میں سماج کے کئی اہم پہلو موجود ہیں۔

(سہ ماہی کتابی سلسلہ کاوش، شاہجہاں پور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۵ء، جلد۲، شمارہ ۷-۸)

☆☆

....

for inside flaps

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ (مختصر تعارف)

آپ کا اصلی نام:۔صادقہ آراء۔شادی سے پہلے صادقہ آراء سحرؔ کے نام سے شائع ہوئی ہوں۔

آپ کی تعلیم:۔ پی ایچ ڈی ،ایم اے (اردو)،ایم اے (ہندی)،ایم اے (انگریزی)،

ڈی ایچ ای،سیٹ۔

ادبی شناخت:۔ناول وافسانہ نگار، شاعرہ، ڈرامہ نگار، تنقید، بچوں کا ادب۔

ذریعۂ معاش:۔درس وتدریس۔ایسوسی ایٹ پروفیسر، رِیسرچ گائیڈ شعبۂ ہندی، ممبئی یونیورسٹی)

شوہر:۔محمد اسلم نواب

والدین:۔مرحوم خواجہ میاں صاحب اور مرحومہ شرف النساء بیگم صاحبہ۔

پتہ:۔۳۰۱، صادقہ مینشن، شاستری نگر، کھوپولی، ضلع رائے گڑھ، مہاراشٹر-۴۱۰۲۰۳

فون:۔۶۷۰۵۴ ، ۰۲۱۹۲_۶۲۷۲۰، ۰۹۳۷۰۸۲۱۹۵۵

مطبوعہ اردو کتابیں:

۱۔ انگاروں کے پھول (شعری مجموعہ) ۱۹۹۶ء

۲۔ پھول سے پیارے جگنو (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰۳ء

۳۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ۲۰۰۸ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۴۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ۲۰۱۰ء شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی

۵۔ مکھوٹوں کے درمیان (اردو کا طبع زاد ڈرامائی مجموعہ) ۲۰۱۲ء تخلیق کار پبلشر، دہلی

۶۔ خلش بے نام سی (افسانوں کا مجموعہ) ۲۰۱۳ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۷۔ جس دن سے ....! (ناول) ۲۰۱۶ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۸۔ پیج ندی کا مچھیرا (افسانوں کا مجموعہ)، ۲۰۱۸ء، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مطبوعہ ہندی کتابیں:

۹۔ پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ، (مجروح سلطانپوری کی کلیات کا ترجمہ و ادارت ہندی میں، سارانش پرکاشن، دہلی، ۲۰۰۰ء
۱۰۔ لوک پریہ کوی مجروح سلطانپوری (مجروح سلطانپوری کی غزلوں کا ترجمہ و ادارت ہندی میں، وانی پرکاشن، دہلی، ۲۰۰۲ء
۱۱۔ ہندی غزل: فکر و فن، خصوصی جائزہ: دُشینت کمار (تحقیق)، ۲۰۰۷ء
۱۲۔ پتھروں کا شہر، ۲۰۰۳ء
۱۳۔ کہانی کوئی سناؤ متاشا (ناول) ہندی میں بھاؤنا پرکاشن، دہلی، ۲۰۰۹ء
۱۴۔ منّت۔ (افسانوی مجموعہ بھارتیہ بھاشا پریشد، کولکاتا، 'یُو الیکھک پُستک پرکاشن سمّان' کے تحت شائع شدہ)، ۲۰۱۲ء
۱۵۔ ساہتیہ میں آلو چنا کی چھنا (تنقیدی مضامین، وانگمئے پرکاشن، علی گڑھ)، ۲۰۱۲ء
۱۶۔ جس دن سے ....! (ناول)، بھاؤنا پرکاشن، دہلی، ۲۰۱۷ء

مطبوعہ تیلگو کتاب:

۱۷۔ نی کتھاوِنی پنچُو متاشا (کہانی کوئی سناؤ متاشا) (ناول) ۲۰۱۴ء

مطبوعہ انگریزی کتابیں

۱۸۔ غزل اینڈ اوڈ (تحقیق) ۲۰۱۰ء
۱۹۔ Tell me a story, Mitasha (کہانی کوئی سناؤ متاشا) (ناول) ۲۰۱۴ء

دوسری زبانوں میں ترجمے :

اردو، ہندی کے بعد پنجابی، تیلگو، کنڑ، انگریزی، مارواڑی، اور مراٹھی زبانوں میں بھی

ترجمے ہوئے ہیں۔

صادقہ نواب پر کتابیں، رسائل:

۱۔ ''صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن: فکشن کے تناظر میں''، مرتبین: پروفیسر تراب علی یداللہی، اسلم نواب

۲۔ ''صادقہ نواب سحر: شاعری کے تناظر میں''، مرتبہ: حبیب النساء بیگم

۳۔ سہ ماہی اسباق نمبر، اکتوبر ۲۰۱۰ء، مارچ ۲۰۱۱ء

۴۔ ماہنامہ شاعر نمبر، مارچ ۲۰۱۷ء

نصابی کتابوں میں شامل:

۱۔ بال بھارتی کی اردو کی پانچویں کی کتاب میں نظم ''آؤ دعا مانگیں'' شامل

۲۔ مغربی بنگال بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی اردو کی دسویں کتاب میں ڈرامہ ''سلطان محمود غزنوی'' شامل

انعامات و اعزازات:

۱۔ مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا سنہ ۲۰۰۸ء کے لئے ''ساحر لدھیانوی ایوارڈ''

۲۔ 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' پر: بہار اردو ساہتیہ اکادمی کا ''رشیدت النساء ایوارڈ''، اتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی کا کل ہند ایوارڈ، مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کا جینیندر کمار ایوارڈ، بھارتیہ بھاشا پریشد، کولکاتا کا 'لیکھک پرکاشن سمّان'، اس ناول کے ترجمے پر ڈاکٹر حسینہ بیگم کو 'کُسم ریڈّ ماساٹھی پُرسکار م' ایوارڈ

۳۔ 'خلش بے نام سی' (افسانوی مجموعہ): بہار اردو ساہتیہ اکادمی کا ''شکیلہ اختر ایوارڈ''، اتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی کا ''کل ہند ایوارڈ''، مغربی بنگال اردو ساہتیہ اکادمی کا ''مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ''

۴۔ 'مکھوٹوں کے درمیان' (اردو کا طبع زاد ڈرامائی مجموعہ): مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کا انعام

۵۔ 'منّت' (افسانوی مجموعہ) پر: مہاراشٹر ہندی ساہتیہ اکادمی کا 'منشی پریم چندر ایوارڈ'

۶۔ 'جس دن سے' (ناول) پر: مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی، بہار اردو ساہتیہ اکادمی

photo of Habibunnisa

Back cover page

حبیب النساء بیگم

پیدائش : ضلع پربھنی (مہاراشٹر)

شوہر : محمد اطہر انعامدار

والدین : خیرانساء بیگم اور سید یوسف علی مرحوم

تعلیم : ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (سوشیالوجی)

بی۔ایڈ، نیٹ پاس

پی۔ایچ ڈی : مقالہ کا عنوان ''مہاراشٹر میں اردو ناول ۱۹۸۰ء کے بعد''

سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ (گائیڈ: ڈاکٹر محمد مقبول احمد مقبولؔ)

رابطہ : کرانتی چوک بھاجی مارکیٹ ضلع پربھنی ۔مہاراشٹر 431 401

فون : 9561580046

ای میل : habibainamdar.123@gmail .com

اوراتر پردیش اردو ساہتیہ اکادمی کے فکشن ایوارڈ

۷۔ مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے 'میرتیج بیورؤ نامی یکبابی ڈرامے کو' بیسٹ اسکرپٹ رائٹنگ کا انعام 'پروین شاکر ایوارڈ'، اسباق میگزین ایوارڈ، مجروحؔ اکادمی ایوارڈ، آدرش شکشک پُرسکار، شری بالوجا ساہتیہ کلا اکادمی ایوارڈ، مہاراشٹر گوروپرسکار وغیرہ

بیرونِ ممالک اسفار:

ماریشس، دوبئ، جدّہ، لندن، پیرس، سویٹزرلینڈ

SADIQUA NAWAB SAHER
SHAYERI KE TANAZUR MEIN

Edited by

Habibunnisa Begum Syed Yusuf Ali

نام : حبیب النسا بیگم

پیدائش : پربھنی (مہاراشٹر)

شوہر : محمد اطہر انعامدار

والدین : سید یوسف علی، خیر النسا بیگم

تعلیم : ایم۔اے (اردو) ایم۔اے (سوشیالوجی)

بی۔ایڈ۔نیٹ پی۔ایچ۔ڈی (جاری)

مقالے کا عنوان : ''مہاراشٹر میں اردو ناول 1980ء کے بعد''

گائیڈ : ڈاکٹر مقبول احمد مقبول

فون : 9561580046

رابطہ : بھاجی مارکیٹ، کرانتی چوک، ضلع پربھنی۔مہاراشٹر 431-401

ای۔میل : habibainamdar.123@gmail .com

ملازمت : تدریس سنیئر لیکچرر (جز وقتی) شعبۂ اردو

گیان اپاسک کالج، جنتور روڈ، پربھنی

شائع شدہ مضامین : ملک کے ادبی رسائل و جرائد میں تحقیقی و تنقیدی

: مضامین کی اشاعت

سمینارس کانفرنس : مختلف قومی و بین الاقوامی سمینارس

: ورک شاپ اور کانفرنس میں بحیثیت مقالہ نگار شرکت

ISBN 978-93-88105-60-6

978-93-88105-60-6

www.ephbooks.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

New Delhi , INDIA